مقالات جامعی
غامدیت پر مشتمل جدید فکر کا محاسبہ علمی کرتے سید خالد
جامعی کی محققانہ تحریروں کا مجموعہ
جلد :دویم
مرتب کردہ
ڈاکٹر محمد علی جنید
KURF
Karachi University Research Forum
جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

©™ مقالاتِ جامعی

سید خالد جامعی کے جاوید احمد غامدی صاحب پر نقدِ علمیہ کا مجموعہ

جلد دوئم

مرتب کردہ،تہذیب ،سرورق،ترتیب ،پیشکش و اشاعت

محمد علی جنید

تاریخ اشاعت

۲۰۱۴ء۔۹۔۹۔

بشکریہ : سید خالد جامعی،ماہنامہ ساحل۔کراچی

www.facebook.com/kurf.ku
www.kurfku.blogspot.com

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش

Karachi University Research Forum.

تعارف

سید خالد جامعی صا حب اردو زبان میں جدیدیت اور پس جدیدیت کے تناظر میں ایک بڑا نام ہیں عصر حاضر میں جدید فلسفہ ،مغربیت ،جدیدیت ،مسلم جدت پسند شخصیات و کُتب پر انکا تحریری سرمایہ،نقد و جرح محققین کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے ۔

خالد جامعی صاحب ۱۹۵۸ کو پیدا ہوئے،اور ۱۹۸۵ میں انھوںنے جامعہ کراچی،شعبہ ابلاغ عامہ سے اپنا ماسٹر کیا ۔انکا تعلق کچھ عرصہ طلبہ سیاست سے بھی ر ہاہے ،سمجھیں جس جدت پسندی ،جمہوریت و مغربیت پر انکا قلم نقدی سخاوتوں کا مظاہرہ کرتا ہے وہ ان سب عملی مباحث سے نا صرف واقف حال ہیں بلکہ ان سے انکا تعلق کسی نہ کسی بنیاد پر رہا ہے ۔

لہذا اس کوچہ اور فکری بحث کی مبادیات سے انہیں عملی واقفیت بھی طلبہ سیاست کے دوران بخوبی رہی ،انھوںنے لبرلسٹس،لیفٹسٹوں،لبرل جمہوریوں کو قریب سے دیکھا،خالد جامعی صاحب ،بعد ازاں ایک طالب علمانہ دور سے گزر کر جامعہ کراچی سے انتظامی طور پر بہ سلسلہ روزگار وابستہ ہوگئے ،انھوںنے اس دوران نظمیہ جاتی گوناگوں ذمہ داریاں سرانجام دیں جن میں ہماری معلوما ت کی رو سے اسٹنٹ رجسٹرار ،ڈپٹی رجسٹرار سے لیکر ناظم شعبہ تصنیف و تالیف تک کی ذمہ داریاں خاص الخاص ہیں اور تاحال ممدوح ثالث الذکر ذمہ داری کو سر انجام دے رہے ہیں ۔

ایک قولِ جامعی کے مطابق جب انھوںنے شعبہ تصنیف و تالیف[1] کی ذمہ داریاں ۲۰۰۱ء میں سنبھالیں تو جو خدمات انھوںنے سرانجام دیں اور اس پیشہ ورانہ سفر میں جو کامیابیاں بٹوری اسکا حال ذیل میں خود انکی زبانی پیش کیا جاتا ہے۔

شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ میں اہم ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے راقم الحروف کو تین برس گزر چکے ہیں۔ ۲۵ جنوری ۲۰۰۱ء کو راقم نے اس شعبے کی نظامت سنبھالی، تب شعبے کے سالانہ اخراجات ۲۷ لاکھ روپے تھے، اب الحمدللہ شعبے کے اخراجات صرف ۲۳ لاکھ روپے سالانہ ہیں۔ میری نظامت سے قبل ۲۰۰۰ء میں شعبہ تین لاکھ روپے کے خسارے میں تھا، الحمدللہ اب اس کا خسارہ ختم ہوگیا ہے اور ۲۰۰۳ء میں ہمیں تیس لاکھ روپے کا خالص نفع حاصل ہوا ہے اور کارکردگی کا معیار پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ سالانہ اخراجات کی مد میں پچاس لاکھ روپے سالانہ بچت کسی تبصرے کی محتاج نہیں، اخراجات میں پچاس لاکھ روپے کی بچت شعبے کے رفقائے کار کے بے لوث تعاون، دیانتداری اور انتھک محنت کے بغیر ممکن نہ تھی۔

طویل عرصے کے بعد شعبے کے زیر اہتمام نئی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے عہد نظامت میں اس طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ عبدالمجید سالک کے کالموں کا انتخاب ''افکار وحوادث'' کے نام سے دو جلدوں میں، مہدی علی صدیقی کی خودنوشت سوانح ''بلاکم وکاست'' اور بروشسکی زبان کی قواعد ''شمول بوق'' اور ڈاکٹر عاقل برنی کی کتاب "Risk Theory and Insurance" شائع ہوئی۔

''جریدہ'' جو شعبے کا علمی وتحقیقی رسالہ ہے، اس کا آخری شمارہ نمبر سترہ، ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد جریدہ بند ہوگیا۔ الحمدللہ سترہ سالہ تعطل کے بعد جریدہ باقاعدگی سے دوبارہ شائع ہونے لگا، شمارہ نمبر اٹھارہ اصطلاحات ابلاغیات، شمارہ نمبر انیس اصطلاحاتِ جمالیات، شمارہ نمبر بیس اصطلاحاتِ ماحولیات اور شمارہ نمبر اکیس لسانیات نمبر تھا۔ شمارہ نمبر بائیس وادی سندھ کے رسم الخط پر دنیا بھر میں ہونے والے تحقیقی کام کا احاطہ کر رہا ہے۔ اس شمارے میں موئن جودڑو کی دو ہزار مہریں پڑھنے والے پاکستانی محقق مولانا ابوالجلال ندویؒ کے نو تحقیقی مضامین شامل ہیں جو وادی سندھ کے رسم الخط کے بارے میں نئے انکشافات پر مشتمل ہیں۔

ابو جلال کی یہ شاہکار اتکشافاتی تحقیق رب العالمین کے فضل و کرم سے ہم آن لاین پیش کرچکے ہیں ،اسکے علاوہ لغتِ متروکاتِ اردو، جیسی اہم آن لاین اشاعت کی برقی اشاعت خالد جامعی کے سبب ممکن ہوئی ہے ،ہماری ساری ذاتی آن لاین برقی اشاعتیں کسی نہ کسی صورت میں انکے تعاون کی مرہونِ منت ہیں ۔

خالد جامعی نے مرحوم ڈاکٹر خالد حسن صاحب کی لغت متروکات اردو کو قابلِ اشاعت بنانے میں جس علمی جانفشانی کا مظاہرہ کیا اسکو جتنا سراہا جائے کم ہے۔

جناب خالد جامعی صاحب کا تعلق جامعہ کراچی کے دبستان فکر سے ہے[2]

اور اس علم کلام کے بانی و مبتدی جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ہیں ،اور ان سے جو نام پھوٹے ان میں جناب پروفیسر ڈاکٹر علی محمد رضوی،جناب پُروفیسر زاھد صدیق مغل،جناب امین اشعر ،مولانا محمد احمد ،جناب ڈاکٹر محبوب الحسن رضوی ،سید خالد جامعی اور ڈاکٹر عبدالوہاب سوری خاص الخاص ہیں ۔

خالد جامعی اگر ایک رسمی سے ناظم الشعبہ ہوتے تو کوئی انھونی بات نہ ہوتی کہانی میں نیا موڑ یہ آیا کہ جب اِن لوگوں نے پاکستانی معاشرے پر نگاہ ڈا لی تو اندازہ ہوا کہ جدیدیت ،پس جدیدیت اور سائنس نے پوری اُمت مسلمہ کے نئے عصری مذہب کا درجہ حاصل کر لیا ہے ،اس پر مستزاد مغربی علم سیاسیات کے سبب اب تمام علمی و مذہبی جواز ،عدم جواز ،حق وباطل،صحیح و غلط کا فیصلہ مغرب سے اخذ کردہ سیاسی فلسفیانہ قدروں اور ان سے اخذ کردہ نیم پختہ افکار کی روشنی میں کیا جا رہا ہے ۔

اور اسے سے کیا عامی کیا خاصی ،کیا امیر کیا غریب،کیا مسٹر اور کیا مولوی کون ہے جو اس مرعوبیت کی فضا میں تر بتر نہ ہوا ہوچناچہ ان حضرات نے اول مغربی علوم و کتب کو کنگھا لنا شروع کیا ،دن رات دنیا بھر میں سیاسیات،فلسفہ،قانون ،سائنس و ٹیکنالوجی،معاشیات اور دیگر علوم میں ہونے والی تحقیقات سے نا صرف خود واقفیت حاصل کی بلکہ ساتھ ساتھ جامعات اور مدارس کے طالبان علم کی بھی تربیت کا آغاز کیا ۔

میری کبھی ڈاکٹر جاوید صاحب سے ملاقات تو ہو نہ سکی ہے کیونکہ میں بھی جامعہ کراچی و دیگر جامعات کے طلبا کی علمی تربیت سے ہٹ کر میل ملاپ ،آنے جانے گھومنے سے پرہیز کرتا ہوں ۔

ایک ہمارے آزاد خیال جدت الفکر جامعاتی ساتھی نے میری توجہ جریدوں کی طرف اس دوران کروائی جب خاکسار جامعہ میں پی-ایچ ـڈی کی تحصیل میں مگن تھا لہذٰا خالد جامعی صاحب کی تحریروں سے آشناہ ہوا اور خالد جامعی صاحب سے ملاقات،تبادلہ خیال کا سلسلہ شروع ہوا جو اب قریباً چھ ،سات سال سے جاری ہے ۔

اور مجھے معلوم ہوا کہ جامعی صاحب عرصے سے نہ صرف ہر ہفتہ ایک دن خاص کسی اہم کتاب پر تبصرہ کی نشست اپنے شعبہ میں رکھتے ہیں بلکہ ،توسیعی لیکچروں کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے ،جن طلب علموں کی تربیت کی جاتی ہے ان سے بھی لیکچر دلوائے جاتے ہیں ۔

خالد جامعی صاحب کی لو گوں کی علمی خدمت و رہنمائی کی یہ کیفیت ہے کے وہ رات گئے تک لوگوں کی رہنمائے فر ماتے رہتے ہیں ،خاکسار ویسے تو انکا کوئی شاگرد نہیں نہ اس قسم کی نشست کا حصہ ہے مگر ان سر گرمیوں سے نہ صرف واقف ہے بکہ خود بھی متلاشیان علم کو وہاں جا نے کا مشورہ دیتا رہتا ہے۔

خالد جامعی کی مشہور فلسفی وہاب سوری صاحب ،صدر شعبہ فلسفہ ،جامعہ کراچی سے خاص علمی یاری و دوستی ہے اور اس ضمن میں خالد صاحب کا کھل کر ساتھ دیتے ہیں سوری کے آن لائن لیکچر آرام سے گوگل کرکے آن لائن ڈھونڈھے جا سکتے ہیں ۔

ایک اندازہ کے مطابق خالد جامعی کے ذاتی کتب خانے میں مختلف علوم پر ۲۰۰۰۰ کتب موجود ہیں ،انکے دفتر کی میزوں کرسیوں پر بھی جا بجا کتابیں،کتب کی فوٹو اسٹیٹیں براجمان دیکھی جاسکتی ہیں ،مطلب کا غذ اور خالد جامعی کی باہم خاص شناسائی و دوستی اور یہ خاکسار کا بھی حال ہے جبھی میں ان سے اکثر علمی امر سے زیادہ تحریروں کی ہی بات کرتا ہوں کہاں ،چھپی،کب چھپی،مطبع کونسا ہے اور لکھاری یا محقق کون ہے ؟۔

جدیدیت پر تو خیر خاکسار نے بھی مطالعہ جاتی کافی نگاہ ڈالی ہے مگر مسلم جدیدیت کو جس ذاویے فکر سے خالد جامعی نے دیکھا اور بیان کیا مگر جو انکا طرز اندازہے وہ نرالا و منفرد ہے جو ان ہی کا ہی طرہ امتیاز ہے۔

میں ایک سیاسی سائنسدان و عالم کے طور پر رواجی پاکستانی جامعات کی علمی بوسیدگی کا شکار تھا ،اور مجھے اس کے اعتراف میں کوئی خوف و شرم نہیں کے جریدوں نے اور ان میں چھپنے والی تحریروں نے ہی خاکسارکو جان رالز ،ہیبر ماس ،فوکالٹ اور کارل پوپر سے واقف کروایا مطلب ہم جس جدیدیت کا راگ علمی بنیادوں پر آلاپ رہے تھے وہ بھی سمجھیں کارل مارکس پر آکر دم توڑ دیتا ہے ۔ پس جدیدیت اور ما بعد حریت سے تو ہمارے اکثر اساتذہ بھی واقفِ حال نظر نہیں آتے ہیں تو وہ ہمیں کیا واقف کرواتے اور نا نصاب میں یہ مباحث ذیر بحث لائے جاتے ہیں ۔

میرے علم کے مطابق پاکستان میں جامعہ کراچی کا شعبہ فلسفہ ،واحد شعبہ ہے جہاں یہ مباحث اور فلسفہ سائینس پڑھائے جا تے ہیں اور جامعہ کراچی مکتبہ فکر اس ضمن میں قابل تعریف ہے کے اس نے اُس وقت جب جامعات میں اساتذہ و طالب علموں میں ایک مخاصمانہ بعد ،دوری پائی جاتی ہے ،اساتذہ پڑھاتے کم ہیں اور دفتروں میں خواتین سے نیناں زیادہ لڑاتے ہیں ،پسند نا پسند پر طالب علموں کامیاب اور ناکام قرار دیا جاتا ،ہے انھیں عرصہ تک لٹکایا جاتا ہے ،اس دبستانِ فکر نے نہ صرف طلبہ و طالبات کو بتایا کہ

ؔ کہتے ہیں جسکو مغرب وہ یہ ہے وہ نہیں جسے پڑھا تھا تم نے داستان پوٹر میں

سادگی نہیں ایسی اس میں کہ تم صدقے جاو واری جاو -اپنی تہذیب سے نا واقف پکارے جاو

ڈس لیا اس تہذیب کی ڈم کو خود اجگرِ ذات نے ،نسل گھٹتی جاتی ہے اور مقلد بڑھتے جاتے ہیں۔

أج مکتبہ جامعہ کراچی نے مسٹر اور مولوی کو ساتھ بٹھا دیا اور دونوں کا اتفاق ہے ،اور دونوں باہم شیر و شکر ہوکر صرف ایک تہذیب ،ایک حکومت ایک،روایت اور ایک ہی اصول کے رائج کرنے کے لئے بے قرار ہیں اور وہ ہے دین اسلام ،کلمہ شہادت ، قران و سنت اور أثارِ سلف و صالحین کی تعلیمات سے اخذ کردہ تہزیب و تمدن،حکومت و روایت،اور أصولی ظابطہ حیات۔

مکتبہ غامدیت ویسے تو پاکستان میں پیدا ہوا مگر اس کے پیش رو ارتقائی طور پر معتزلہ،سرسید،چکڑالوی،پرویزی مکاتبِ فکر ہیں ،مگر دین کو جتنا مختصر و محدود اس مکتبہ فکر نے کیا اور جس طرح انہوںنے مردہ ہوتی پرویزیت کو نیا جنم دیا ،اس پر مستقبل کے معتزلہ جناب جاوید غامدی صاحب کو امام قرار دینگے۔

غامدیت نے ایک طرح سے مسلمانوں کی مذہبی اقدار کے طرف رجعت کے عمل کو معاشرے میں قران و حدیث کی طرف نئی نسل کے جھکاو کو بند باندھ کر روکنے کی کوشش کی ہے اور اس عمل میں ۲۰۰۰ء سے پاکستان میں پروان چڑھتے بے لگام ذرائع ابلاغ نے اہم کردار ادا کیا ہے،اوپر سے ایک ماننے والی بات یہ ہے جناب غامدی نے جو لوگ تیار کئے ہیں وہ تزویراتی لب و لہجہ،متانت اور حلم کے حامل نرم و ٹھنڈے لہجہ کے ذریعے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

قران کو ماخذ تسلیم کرکے اسی پرانی پرویزی مکھی کے پروں کو نئی چینی ساختہ غامدی مکھی کی پشت پر مار دیا گیا ہے ،جس کے ذریعے دینی علمیاتی نراجیت کا مظاہری کیا گیا ہے حدیث کو ماخذ دین سے درجہ تنزلی سے روشناس کراکے قران کی من چاہی ،سیاق سباق سے ہٹ کر تشریح ،توضیح و تاویل سے اپنانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے،

روز سو کر أٹھتے ہیں نئی سنت کی فہرست جاری کردی جاتی ہے ،اگر مسواک کرکے قلم أٹھاتے ہیں تو سنت گھتادیتے ہیں ورنا مسواک کو قلم بنا کر بڑھا دیتے ہیں ۔

غلام احمد قادیانی،چکڑوالوی،پرویزی طاغوطیت سے پولیٹیکل سائنس اور پالیٹیکل اکانومی کے اصولٓ ضوابط نکالے جاتے ہیں .علمیاتی بنیادوں کی ایسی نراجیت سوائے ملحدوں و تشکیکیوں کے اور کہیں نہ دیکھی گئی نہ سنی گئی۔

غامدیت پر ویسے تو بہت کچھ لکھا گیا ،سنا گیا ،مولانا صلاح الدین یوسف ،مولانا رفیق چوہدری ،حافظ زبیر نے اس پر خوب لکھا ،مگر یہ بھی مانے کی بات ہے کے غامدی حدیث اور اس سے اخذ کردہ فقہی دلایل کو خاص اہمیت ہی نہیں دیتے جو اثر ہوتا اس میدان میں ایک نیا شہسوار پیدا ہوا جس نے نا صرف مغرب کو خوب پڑھا بلکہ وہ مسلم جدیدیت کے دلا یل ،وسایل اور علمیت کا بھی واقفِ حال ہے ،ہیرے سے ہیرا ،لوہے سے لوہا کاٹنے کی مثل کو اپناتے ہوئے جگہ جگہ یہ علمی تعاقب کیا کہ اگر جدیدیت و مغربیت ہی تمہاری بنیاد ہے تو لو جناب تم نے تو مغرب کو بھی صحیح نہی سمجھا

،جانا اور پہچانا جس کے دم پرایسی بڑی بڑی خود ساختہ دلیلیں قایم کی جایں اسلام کے دائرے میں رہنا توچاہیں مگر اسلام ایک ترمیم شدہ ،مغرب ذدہ خالصتاً اصطلاحاتی لبرلائزڈ اسلام لگےنا کہ محمد ﷺ پر تنزیل شدہ اسلام لگے۔

نا تم مغربی کلاسیکیت سے واقف اور نہ تمہیں روحِ روشن خیالی ،حریت فکر ،نشاۃ ثانیہ کے نفس مضمون سے لینا دینا تمہارا طریقہ کار سوفسطایوں اور تھیو سوفیوں کی مانند نرم ،گرم حلم سے لبریز شریں زبانی ٹھری مگر بھایوں یہ علمی سے ذیادہ شاعروں کا خاصہ ہے اور تم اپنی حلاوت کے نیچے کیسے مذہب شکن نشتروں سے مزین بیٹھے ہو۔

خالد جامعی نے اشراق کے مضامین اور المیزان کو بار بار پڑھا اور بار بار نئے تناظر میں غامدیت کا علمی تعاقب کیا،میں نے جب خالد جامعی کی جریدہ ،الواقعہ،البرھان اور ساحل میں غامدیت پر چھپنے والی تحریروں کو جمع کیا اور انھیں مقالاتِ خالد جامعی کی اولین برقی جلدوں کی صورت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا اُسی کے ضمن میں یہ اول برقی جلد پیشِ خدمت ہے اس میں صاحب مضمون سے اختلافِ علمی کی گنجایش موجود ہے جسکے ضمن میں ان سے خط و کتابت ممکن ہے۔

یہ دوسری جلد بھی غامدیت سے متعلق ہے اسکے بعد والی جلدیں دیگر جدید مباحث پر نقد سے مزین ہونگی خالد جامعی کی دیگر تحریروں کو پسند کرنے والے حضرات کو یہ سلسلہ امکان ہے کہ پسند أئے،اسکے ساتھ میں یہ بھی واضح کردوں ،خالد جامعی سے جب میں اس بابت ملنے گیا ور مقالات پر کام سے أگاہ کیا اور ان سے انکی زندگی کی بابت معلومات دریافت کرنا چاہی تو انھونے مجھے فرمایا میرا خیال ہے اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے أپ اگر صرف مقالہ جمع کرکے پیش کرنا چاہیں تو اجازت ہے جبھی میں ان کی حیات کے پہلووں کو اتنی وضاحت و صراحت سے عیاں نہیں کرسکا جیسا اسکا حق تھا۔

اس مقالاتی مجموعے کو اول سادہ ہیت میں پیش کیا جارہا ہے ،أیندہ کی اشاعتوں میں تبویب قایم کرنے کی کوشش کی جائیگی ،اس کتاب کو پڑھنے کے لیے ایکروبیٹ ریڈر استعمال کیا جائے تو عمدہ ہوگا تاکہ عدد صفحات دیکھنے میں أسانی ہو۔ یہ مقالاتِ جامعی کے سلسلہ کی جلد دویم ہے یوں جلد اول اور دویم کا براہ راست موضوع جاوید احمد غامدی صاحب کا علمی نقد ہے ،أیندہ کی جلدیں اس کے برخلاف مغربیت و جدیدیت کے مختلیف علمی پہلووں سے متعلق ہونگیں امید واثق ہے کے اس ناچیز کی یہ سعی طالبانِ علم و دانش کو پسند أئیگی ۔

ڈاکٹر محمد علی جنید

قران کو دعوتِ مقابلہ

۱۹۷۵ میں غامدی صاحب نے قرآن کا چیلنج قبول فرمالیا تھا

سیالکوٹ میں غامدی نے خودساختہ ۴۰ آیات پیش فرمائیں

عربی زبان ولغت کے سب سے بڑے عالم: جاوید غامدی

سیالکوٹ میں علامہ ساجد میر کے بھانجے مستنصر میر کے توسط سے جاوید غامدی صاحب کا ایک حلقہ احباب ایام جوانی میں قائم ہوگیا تھا جہاں غامدی صاحب کی عربی دانی کے چرچے تھے غامدی صاحب اکثر و بیشتر سیالکوٹ تشریف لاتے اور سبعہ معلقہ، کلام عرب، قرآن حکیم پر اپنے ارشادات سے محافل کو گرماتے تھے عربیت کا ذوق وشوق اس زمانے میں نکتہ عروج پر تھا اور سرور کی ایک کیفیت نے ان کا احاطہ کر رکھا تھا اس دور میں غامدی صاحب اپنے آپ کو سُوق عکاظ کا سب سے بڑا شاعر خطیب، ادیب داستان گو اور محفل آراء سمجھتے تھے۔ بسا اوقات وہ لبید، امرؤالقیس، اعشیٰ، حارث بن حلزہ، قس بن ساعدہ، زہیر، عمرو بن کلثوم، نابغہ، طرفہ، عنترہ کی عربی دانی کو ہیچ قرار دیتے اور کلام عرب میں وہ نقائص دکھاتے جو ہم متبدیوں کے لیے طلسم خانہ حیرت کے در کھول کر رکھ دیتے کیوں کہ اس حلقہ میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو غامدی صاحب کے دعاوی کا ناقدانہ جائزہ لینے کی اہلیت رکھتا وہ گفتگو کرتے تو اصمعیات، سبع معلقات، البیان والتبیین، الکامل فی اللغۃ والادب، جمہرۃ اشعار العرب، مختارات شعراء العرب، الفحول، دیوان المعانی، مفضلیات اور حماسہ میں عیب دکھا دیتے۔ لغت عرب کی امہات کتب التہذیب، المحکم الصحاح اور الجمہرہ کے ورق ورق کو تار تار فرما دیتے کلام منحول پر وہ خطبات دیتے کہ سننے والا ششدر رہ جاتا اور غامدی صاحب کے سحر میں گرفتار ہو جاتا۔ غامدی صاحب پر عربی کا جنون سوار تھا وہ جاحظ، ابن قیتبہ، ابوالفرج، ابن عبدربہ، ابوحیان التوحیدی، امام شافعی، القیشری، ابن جوزی، امام غزالی کی عربی میں سینکڑوں نقائص نکال دیتے تھے۔ تکبر علمی کے اسی زمانے میں حضرت والا نے قرآن کے اس دعوے کا ''ایک آیت اس کی مثل بنالاؤ'' کا جواب دینے کے لیے چالیس آیات تصنیف فرمائیں اور سیالکوٹ میں ایک نشست میں یہ سورتیں سنائیں۔ یہ نشست کہاں ہوئی اس کی بھی کچھ دلچسپ اور لذیذ تفصیل سنیے:

علامہ ساجد میر کا خاندان اور غامدی صاحب:

۱۹۷۵ء میں جناب غامدی صاحب ممتاز اہل حدیث عالم علامہ ساجد میر کے بھانجے ڈاکٹر مستنصر میر کی دعوت پر سیالکوٹ تشریف لائے، کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک ممتاز راسخ العقیدہ گھرانے کا ہونہار فرزند غامدی صاحب جیسے جاہل، عربی زبان سے ناواقف، دینی علوم اور مغربی علوم سے لاتعلق لاعلم فرد کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سہیل طفیل نشتر میڈیکل کالج میں سال دوم کے طالب علم تھے [ڈاکٹر صاحب مستنصر میر کے خالہ زاد بھائی اور علامہ ساجد میر کے بھانجے جواب ممتاز ماہر قلب بھی ہیں]، اور جس گھر میں رہتے تھے۔ اس گھر کے بالکل سامنے ایک چھوٹی سی گلی میں میر خاندان کا ایک آبائی مکان جس کا نمبر ۶۹۴/۳۱ جو آج بھی موجود ہے اور جناب عبدالوکیل میر صاحب یہاں قیام پذیر ہیں۔ اس وقت اس گھر کے مالک عبدالرؤف میر تھے، جناب غامدی صاحب کی میزبانی کی سعادت اس مکان کو حاصل ہوئی۔ اسی مکان میں جناب غامدی صاحب نے قرآن کی وہ چالیس آیات پیش فرمائیں جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ یہ قرآن کے چیلنج کا جواب ہے۔ مولانا میر ابراہیم سیالکوٹیؒ جو رشتے میں علامہ ساجد میر صاحب کے رشتے کے نانا ہیں سیالکوٹ میں ان کی مسجد، مسجد ابراہیمی میں غامدی صاحب نے سورہ عصر کا درس بھی دیا تھا۔ چالیس آیات شیطانی کی مجلس میں راقم بھی حاضر تھا اس کے علاوہ اسد صدیقی، ڈاکٹر سہیل طفیل برادر مستنصر میر، ڈاکٹر مستنصر میر، ڈاکٹر منصور الحمید، اسد صدیقی اور دیگر رفقائے خاص اس موقع پر موجود تھے۔ غامدی صاحب نے بعدازاں یہ آیتیں کتابی شکل میں اشاعت کے لیے منڈی مرید کے ایک کاتب سے کتابت بھی کرائی تھیں لیکن کتابت بہت ناقص تھی لہٰذا مسودہ روک دیا گیا۔ دریں اثناء ڈاکٹر مستنصر میر کی زجر و توبیخ کے باعث غامدی صاحب نے توبہ کر لی اور ان کی توبہ ان کے اس حلقہ مریدین نے قبول بھی کر لی لہٰذا مسودہ ضائع کر دیا گیا۔ راقم کے پاس مسودے کا ایک ٹکڑا محفوظ رہ گیا تھا لہٰذا اس ٹکڑے سے چند آیات کی نقل من وعن حاضر ہے ترجمہ غامدی صاحب کے قلم سے ہے۔

غامدی کی عربی آیات بمقابلہ قرآن:

أُقسم بخالق الخیل، والریح الهابّة بلیل بین الشّرط ومطالع سُهیل، أن الکافر لطویل الویل، وأن العمر لمکفوف الذیل، اتّق مدارج السیل، وطالع التوبة من قُبیل. تنج وما إخالك بناج.	میں اُس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو گھوڑوں کا خالق ہے اور جو رات کو ستارۂ شرط اور سہیل کے طلوع کے بائیں ہوا چلاتا ہے کہ کافر بڑے عذاب میں مبتلا ہے اور کہ عمر کا دامن بندھا ہوا ہے تو سیلاب کے گذرگاہ سے بچ اور پہلے ہی سے توبہ کرلے کہ تو نجات پا جائے گا مگر مجھے توقع نہیں کہ تو ایسا کرے۔
ان مساوي لکثیر، فجازِ مولائي بالاحسان رجلاً أعلمني بعیباً فيّ، اما غیّرته واما سترته، او عرفت مکانه فاضمرته لقد منّ علیّ ذاکره منّة الأضبط علی الرباب،	میرے عیوب بہت ہیں سوائے میرے مولیٰ اس آدمی کو جزائے نیک دے جو مجھے میرا عیب بتلائے تاکہ میں اس کو بدل دوں یا چھپادوں یا اس کی جگہ معلوم کرکے اس کو وہیں ڈھانپ سکوں، اس کا مجھ پر وہی احسان ہوگا جو اضبط بن قریع السعدی کا قبائل رباب کے سر پر تھا۔

ابو العلاء کا معارضۂ قرآن: مسمی الفضول

سیالکوٹ میں قرآن کے مقابلہ پر آیات قرآنی پیش کر کے بعد اسی موقع پر غامدی صاحب نے ابو العُلاء معری کے معارضۂ قرآن کا تعارف بھی کرایا اور بتایا کہ ان کا معارضہ معریؒ کے مقابلہ میں نہایت اعلیٰ درجے کا ہے ابو العلاء کی کتاب مسمی الفصول والغایات [فی محاذاۃ السور والآیات] کا واحد مخطوطہ ان کے دعوے کے مطابق دنیا میں صرف انہی کے پاس تھا جس کے بارے میں ناصر خسرو علوی اور باخرزی صاحب دمیۃ القصر کی شہادت تاریخ میں محفوظ ہے۔ غامدی صاحب کے مطابق ابو العلاء سے کسی نے کہا کہ ''تم نے کتاب تو خوب لکھی ہے مگر اس پر قرآن کی سی رونق کہاں''، اس پر اس نے جواب دیا کہ جب اس کو بھی چار سو سال تک محرابوں میں رٹو گے تو وہ جلاء پا جائے گی۔ جب ان سے حوالہ پوچھا گیا تو فرمایا الصبح المبنی ۱،۳۲ وذہبی وغیرہ دیکھ لو۔

حقیقت یہ ہے کہ آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس نے بچشم خود ابو العلاء کی یہ کتاب دیکھی

ہے، بلکہ ایک کتاب میں تو یہ دعوی ہے کہ یہ ابو العلاء پر محض اتہام ہے۔لیکن غامدی صاحب جس طرح ہر معاملے میں تفرد فرماتے ہیں یہاں بھی سب سے مختلف ہیں۔

معجم الادباء اور ابو العلاء کی کتاب:

ایک اور روایت کے مطابق جو ضعیف ہے یاقوت نے معجم الادباء [۲۳۵×۶] میں اس کتاب کے دھلوانے کا ذکر کیا ہے اور بغداد کے کتب خانہ دار الکتب المامونیہ کے استاد ابن الدیان کا حوالہ دیا ہے اور کتاب کا نام ''نقص القرآن'' بتایا ہے۔ابو المعالی نے اس کتاب کو دھلوانے پر سخت ناراضگی ظاہر کی اور کہا کہ اسے سنبھال کر رکھتے تا کہ اعجاز قرآن پر دلیل ہوتی۔محبّ الدین الخطیب نے حجاز سے ابو العلاء کی کتاب کا ایک جزء حاصل کیا تھا یہ جزء ''اقلید الغایات'' کے ساتھ محفوظ تھا۔

صاحب کشاف کا ابو العلاء پر نقد:

امام فخر الدین نے صاحب کشاف زمخشری کی جانب سے ابو العلاء کی مشکوک کتاب پر ابو العلاء کے خلاف لکھی گئی ان کی قدح [برکشاف ۳×۲۴۴، مطبوعہ مصر ۱۳۱۹ء] کو نامناسب قرار دیا ہے۔ واضح رہے کہ زمخشری کم عمری میں سقط الزند کے حافظ بن گئے تھے۔لہٰذا اپنے محسن پر یہ اعتراض بلا تحقیق امام فخر الدین کو پسند نہ تھا۔ابو العلاء پر ''اخبار ابی العلاء و مالہ و ما علیہ'' کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے اسرار و رموز کھل جائیں گے۔نقص قرآن یا مسمی الفصول کی نسبت ابو العلاء سے ایسی ہے جیسے حمید الدین فراہی سے جاوید احمد غامدی کی نسبت نہ وہ نسبت درست تھی نہ یہ نسبت درست ہے۔ یہ چند اہم گزارشات قارئین ساحل کی خدمت میں پیش کر دی ہیں جو گم شدہ تاریخ کا فراموش شدہ ورق ہے اگر کوئی خامی، عیب، نقص ہو تو بلا تکلف نقد فرمایے کیونکہ راقم حضرت عمر کے اس قول کو آب زر سے لکھنے کے قابل سمجھتا ہے۔

رحم الله من اهدی الیّ عیوبی

اللہ اس بھلے مانس کا بھلا کرے جو میرے پاس میرے عیوب کا تحفہ لائے۔

[ایک واقف راز خاکسار]

غامدی صاحب کے حلقے کے بارے میں چند تجربات و مشاہدات پیش کرتا ہوں پہلی بات تو یہ کہ غامدی صاحب کا فراہی صاحب سے کیا تعلق وہ پابند شرع یہ شرع سے آزاد، وہ ٹوپی داڑھی اور پائنچے تک اوپر

رکھنے کا اہتمام کرنے والے یہ ان سنتوں سے معریٰ فراہی صاحب نے تو امین احسن کے پائینچے قینچی سے کاٹ دیتے تھے کسی کے ایمان کا اندازہ فراہی صاحب داڑھی کی لمبائی سے کرتے تھے اور داڑھی کو ایمان و کفر کا پیمانہ قرار دیتے تھے۔ داڑھی منڈوں کے سلام کا جواب نہ دیتے تھے۔ ان سے ہاتھ تک نہ ملاتے سب کے سامنے ان کی بے عزتی کرتے اور کہتے کہ قیامت سے ڈرو جب سب کے سامنے ذلیل ہونا پڑے گا۔ اس سلسلے میں ذکر فراہی کا ص ۵۲۶، ۸۴۴، ۸۴۵ ملاحظہ فرمایے۔ وہ سنت کی جو تعریف متعین کرتے تھے وہ سلف سے ماخوذ تھی غامدی صاحب کی سنت خود ساختہ ہے۔ غامدی صاحب پہلے فراہی صاحب کے اصول دین مانتے تھے۔ داڑھی کو سنت تسلیم کرتے تھے، پھر گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹاور پر حملے کے بعد داڑھی فطرت ہوگئی اب صرف اچھی چیز ہے، دین کا اس سے تعلق نہیں فراہی صاحب ٹوپی پہنتے تھے۔ غامدی صاحب نہ صرف اپنی ٹوپی اتارتے ہیں بلکہ امت کے تمام اکابرین کی ٹوپیاں اتارنے کا کام کر رہے ہیں، ان کے حلقے میں ہر شخص ٹوپی سے نفرت کرتا ہے لیکن جب ان کے حلقے میں رمضان میں سدا بہار کلب بہادر آباد کراچی میں تراویح کو بدعت کہنے کے باوجود کراچی کے سرمایہ داروں اور خصوصاً دہلی برادری کے سرمایہ دار اور تبت گروپ کے سعید اللہ والا کی خواہش کو پیش نظر رکھ کر غامدی صاحب کے جانشین عامر گزدر سعید اللہ والا کے سدا بہار کلب میں تراویح پڑھاتے ہیں تو سر پر ٹوپی بھی رکھ لیتے ہیں تاکہ المورد کو مال مہیا کرنے والے امراء ناراض نہ ہوں۔ ایک مرتبہ کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو سدا بہار میں تراویح کی بدعت زیر امامت حلقہ غامدی میں شرکت کا موقع ملا، سدا بہار میں تراویح کا منظر بھی ایک عجیب منظر تھا۔ کراچی کے ارب پتی کھرب پتی لوگ ترجمہ و تشریح سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں، کرسیاں صوفے رکھے ہوئے ہیں جہاں بہت سے سرمایہ دار پیر پھیلا کر بیٹھے ہوئے ہیں کچھ کھا رہے ہیں موبائل فون چلا رہے ہیں باتیں کر رہے ہیں فون پر بازار کی باتیں کر رہے ہیں کبھی کبھی ترجمہ بھی سن لیتے ہیں کچھ تدبر قرآن کر رہے ہیں تراویح نہیں پڑھ رہے ایک جگہ اسٹال لگا ہے لوگ تراویح کے دوران وہاں سے کتابیں لے کر پڑھ رہے ہیں، جائے نمازوں پر اکثر لوگ آرام دہ کرسی رکھ کر ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے اور کعبہ کی طرف پاؤں پسار کر بیٹھے رہتے ہیں، اسی سمت ملٹی میڈیا کے ذریعے قرآن کی آیت پردے پر پیش کی جاتی ہیں، ان آیات کا بھی احترام نہیں ہوتا، چار رکعتوں کے بعد وقفہ برائے چائے ہوتا ہے، چائے

کے ساتھ بسکٹ پیش کیے جاتے ہیں اور بسکٹ ہاتھوں میں دیے جاتے ہیں، چائے اور بسکٹ کے حصول کے لیے بھگدڑ مچ جاتی ہے، چائے لینے والے مٹھی میں بسکٹ دبا کر جائے نمازوں پر رکھ دیتے ہیں وہیں سے اٹھا کر کھاتے ہیں جہاں پیر رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے پھر وہیں ہاتھ صاف کر کے تراویح کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں یہ اس شہر کے مہذب، ارب پتی، باعزت لوگوں کے ساتھ دانش سرا والوں کا سلوک ہے کہ معززین شہر کو فقیروں کی طرح بسکٹ اور چائے پیش کی جاتی ہے، بزرگوں کی عزت کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ انھیں چائے ان کی نشست پر فراہم کی جائے۔ گزشتہ سے پیوستہ سال تراویح میں وقفے کے دوران شکیل الرحمان صاحب نے زلزلے کے اسباب پر غامدی صاحب سے گفتگو کے لیے محفل تراویح سے ان کے گھر پر فون ملایا، لطف یہ کہ غامدی صاحب کے پروردگار سرمایہ دار کراچی میں بدعت کا ارتکاب کر کے تراویح پڑھ رہے ہیں اور ان کے روحانی پیشوا غامدی صاحب گھر میں آرام فرما رہے تھے۔ بیگم صاحبہ نے فون اٹھایا آواز محفل تراویح میں آئی کون کیا کام ہے، پانچ منٹ بعد غامدی صاحب اس محفل بدعت سے خطاب کرنے تشریف لے آئے، جدیدیت پسند اسلام اسی کا نام ہے کہ دین تزکیہ، تصفیہ، حضوری قلب نہیں میلا ٹھیلا، چوپال، محفل اور خورد و نوش کے دھندے کا نام ہے۔ سدا بہار میں تراویح کے اہتمام کی کیا ضرورت ہے جب کہ غامدی صاحب اسے بدعت کہہ چکے ہیں اور خود تراویح نہیں پڑھتے بلکہ ان کا فتویٰ ہے کہ تراویح تہجد کے وقت پڑھی جائے اور کسی ایک مقررہ وقت نہیں تو پھر صرف سعید اللہ والا اور کراچی کے چند سرمایہ داروں کی خوشنودی کے لئے دانش سرا کے زیر اہتمام بدعت کا ارتکاب کیوں؟ صرف اس لئے کہ المورد کی مالی امداد جاری رہے اس محفل تراویح میں بڑے بڑے امراء کو چائے اور بسکٹ جس طرح دیے جاتے ہیں اس کا اخلاقی جواز کیا ہے؟ تراویح کی جاءنمازوں پر بسکٹ رکھ کر کھانا وہیں ہاتھ پونچھنا وہیں ہاتھ جھاڑ کر نماز کے لئے کھڑے ہونا کون سی سنت ہے؟ نمازیوں کو سدا بہار والے کم از کم رکابی، طشتری اور کاغذی رومال یا ٹشو پیپر مہیا کر سکتے ہیں لیکن یہ بھی مہیا نہیں کیا جاتا یہ کون سے اخلاق ہیں کون سی تہذیب ہے کس قسم کے ادب آداب ہیں یہ کیسی نفاست ہے تراویح اور ترجمے کے دوران قبلہ رخ ہو کر پیر پھیلانا، آرام سے لیٹ کر قرآن سننا کیا یہ بدعت حسنہ ہے غامدی صاحب کبھی ان امور پر فتویٰ نہیں دیتے اس لئے کہ شکیل الرحمان نے جن لوگوں کو جمع کیا ہے ناراض نہ ہو جائیں یہ دین ہے۔

فراہی، اصلاحی، غامدی مکتب فکر جدید مغربی فلسفے وسائنس کے مباحث سے ناواقف

غامدی صاحب کی تحریروں میں مغربی فلسفہ کا صرف ایک غلط حوالہ

نطشے کے تتبع میں فلسفہ پر کتاب:

غامدی صاحب کے احباب و رفقاء اس بات کا اظہار بڑی شدت سے کرتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے منتہی تھے اور مغربی فکر و فلسفے پر عبور رکھتے ہیں۔ ایام طالب علمی میں انہوں نے نطشے کے تتبع میں اسی انداز پر انگریزی میں ایک فلسفیانہ کتاب نطشے کے منہاج کے مطابق تحریر فرمائی لیکن اس کتاب کی نقل کوئی مہیا نہیں کرتا غامدی صاحب کے رفقاء کے اس دعوے کی تحقیقات کے لئے ساحل نے اشراق کے تیس سالہ رسالے اور غامدی صاحب کی ۳۰۰ تقاریر کا مطالعہ اور معائنہ کیا تو یہ دعویٰ بے بنیاد نظر آیا۔

جاوید غامدی کا نثری سرمایہ نوسو صفحات: عمر ساٹھ سال

واضح رہے کہ جاوید غامدی نے ۶۰ سال کی عمر میں کتابی شکل میں نثر میں صرف نوسو صفحات تحریر فرمائے ہیں۔ [برہان ۳۰۵ صفحات + مقامات ۱۸۲ صفحات + میزان ۳۳۷ صفحات + البیان ترجمہ ۷۶ صفحات] اشراق ۱۹۷۸ تا ۲۰۰۷ء میں ان کے کچھ مقالات و تقاریر شائع ہوئے ہیں ان تمام تحریروں میں کسی مغربی فلسفی و مفکر کا حوالہ نہیں ملتا صرف جنوری ۱۹۷۸ء کے اشراق میں مجوزہ اکادمی کے نصاب کے حوالے سے غامدی صاحب نے خیال و خامہ کے عنوان سے ۸ صفحات کا اداریہ لکھا تھا جس میں کانٹ ہیگل سارتر بلنچلی وغیرہ کا سرسری ذکر کیا گیا تھا لیکن غامدی صاحب نے یہ اداریہ ''مقامات'' میں ''نیا فتنہ'' کے نام سے شائع کیا تو آٹھ صفحات میں سے چھ صفحات حذف فرما دیے اور جو دو صفحات شامل کئے ہیں ان میں مغربی فلسفے سے متعلق تمام سطور خارج کر دی گئیں۔ یعنی وہ اپنے سابقہ موقف سے دستبردار ہو گئے۔

اردو المورد ویب سائٹ: فلسفہ پر صرف ایک مضمون

جناب غامدی صاحب کے ادارہ المورد کی ویب سائٹ http://urdu.al-mawrid.org سے دو مئی ۲۰۰۷ء کو فلسفے کے موضوع پر موجود مضامین و مباحث کا مطالعہ کیا گیا تو فلسفہ سے متعلق غامدی صاحب کا صرف ایک مضمون حق و باطل کے نام سے موجود تھا۔ یہ

مضمون بھی ۱۹۸۸ء کا تھا اور اشراق میں شائع ہو چکا ہے۔ یہی مضمون ''مقامات'' میں اسی نام سے موجود ہے۔ ہم نے اشراق، المورد، غامدی اور دیگر ویب سائٹ پر فلسفے سے متعلق غامدی صاحب کے مکتبہ فکر کے موتی تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر تلاش نا کامی کا پیغام لائی۔ مغربی فکر و فلسفے پر غامدی مکتب فکر کا کوئی کام نہیں ہے۔ یہی حال اصلاحی صاحب اور فراہی صاحب کے کام کا ہے۔ ان دونوں کی تصانیف میں جدید فلسفے وتہذیب وسائنس پر ایک ورق بھی نہیں ملتا اس کے باوجود غامدی صاحب کا جھوٹا دعویٰ ہے کہ دبستان شبلی جدید وقدیم علوم کا جامع ہے۔ فلسفے کو چھوڑ دیجیے۔ مغربی سوشل سائنسز پر بھی فراہی، اصلاحی، غامدی مکتب فکر نے ایک سطر نہیں لکھی یہ ان مباحث کو سمجھنے اور اس پر نقد کرنے کی بنیادی اہلیت سے عاری ہیں۔ منڈی مرید کے میں ۱۹۷۰ء میں غامدی صاحب نے الاشراق کے نام سے اکادمی قائم کی اس میں بھی مغربی فلسفہ نصاب کا حصہ نہیں تھا اور ۱۹۹۳ء میں المورد اکیڈیمی قائم کی گئی تو اس کے نصاب میں بھی فلسفہ، سائنس، سوشل سائنسز کبھی شامل نہ رہے۔ عامر گزدر، مولوی حبیب الرحمان المورد اکیڈیمی سے فارغ التحصیل ہیں اور وہ بھی اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ انھیں کبھی مغربی فلسفہ نہیں پڑھایا گیا۔ مغربی تو کیا یونانی فلسفہ کی تعلیم بھی نہیں دی گئی۔ غامدی صاحب کی زنبیل میں فلسفہ کا طومار یہی پانچ صفحات کا دفتر ہے اس کے سوا ان کے ذخیرہ نوادرات میں فلسفہ پر کوئی تحریر موجود نہیں۔

غامدی صاحب: ہیگل کا دوسطری غلط در غلط حوالہ مقامات میں

جاوید غامدی صاحب کی چار کتابوں [۱]، مقامات [۲] برہان [۳]، میزان [۴]، البیان میں صرف پہلی کتاب ''مقامات'' کے صفحہ ۸۳ پر ایک مغربی فلسفی ہیگل کا ذکر حوالے کے طور پر آیا ہے ان کے موجودہ طبع شدہ نثری ذخیرے میں غالباً کسی مغربی فلسفہ کا یہ پہلا اور آخری حوالہ ہے اور یہ حوالہ بھی مکمل طور پر غلط ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب مغربی فکر و فلسفے کے مباحث، مطالب، متن، سے قطعاً ناواقف ہیں۔ ''حق و باطل'' کے نام سے مضمون میں وہ لکھتے ہیں ''ہمارے زمانے میں فلسفہ جدلیات نے اسے تاریخی اساس فراہم کی ہیگل نے خدا کو روح عالم ٹھہرایا جو تاریخ کے تھیٹر میں انسان۔ ایک بے شعور اور بے ارادہ اداکار۔ کے ذریعے سے اپنی تکمیل کر رہا ہے''۔

غامدی صاحب ہیگل کے فلسفے اور شارحین سے ناواقف:

یہ مغربی فلسفی ہیگل کا صرف دوسطری حوالہ ہے اور یہ بھی مکمل طور پر غلط ہے۔ اس غلط حوالے

سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہیگل کے فلسفے سے بھی واقف نہیں۔ ہیگل نے فلسفے میں Absolute ، World Sprit،Ideal اور Guist کی اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ GOD کی اصطلاح استعمال کر سکتا تھا لیکن اس نے GOD کے بجائے دیگر اصطلاحات کا سہارا لیا کیونکہ وہ خدا کے تصور پر فلسفے کی بنیاد استوار کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہیگل کے تمام اہم شارحین میں سے کسی ایک نے ہیگل کے فلسفے میں خدا کو روح عالم World Sprit کا متبادل یا مترادف قرار نہیں دیا۔ عصر حاضر میں ہیگل کا سب سے بڑا شارح چارلس ٹیلر ہے ہیگل ریڈر اور Sources of self اس کی مشہور کتابیں ہیں اس کی تشریحات میں کہیں روح عالم کو خدا نہیں قرار دیا گیا ہیگل کے شارحین کے دو گروہوں Left Hegalion اور Right Hegalion مکاتب فکر کے کسی مفکر نے روح عالم کو خدا نہیں لکھا مارکسی مفکرین کے دو اہم مکاتب فکر Russian Marxists اور Westren Marxists سے متعلق کسی مفکر نے مارکس و ہیگل پر لکھتے ہوئے روح عالم کے حوالے سے خدا کے تصور کا رسمی ذکر بھی نہیں کیا۔

غامدی صاحب نے رچرڈ رارٹی، ڈیلوز کو نہیں پڑھا:

ہیگل کے منہاج علم میں خدا کے تصور کو شامل و داخل کرنے کا سہرا اردو میں فلسفے پر لکھنے والے دو افراد کے سر ہے بائیں بازو کے مفکر سبط حسن جنہوں نے موسیٰ سے مارکس میں یہ احمقانہ خیال پیش کیا دوسرے جاوید غامدی جنہوں نے مقامات میں سبط حسن کی پیروی میں روح عالم کو خدا قرار دیا۔ غامدی صاحب پوسٹ ماڈرن فلسفہ کے کسی فلسفی سے واقف نہیں۔ وہ گزشتہ پانچ برس سے مغرب کے قصیدے پڑھ رہے ہیں انھوں نے امریکہ کے ریاستی فلسفی رچرڈ رارٹی کی تصانیف اور اکیسویں صدی کے سب سے بڑے فرانسیسی فلسفی ڈیلوز کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ مغرب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے کے تصور سے بھی توبہ کر لیتے وہ وحید الدین خان کی طرح چند مشہور زمانہ کتابوں کو پڑھ کر [Popular books] جنھیں ہم ''چلتا پرزہ'' کہہ سکتے ہیں مغرب کو سمجھنے پڑھنے اور دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ جس فریڈم Freedom کو اسلام سے ثابت کر رہے ہیں اسے مغرب میں کوئی فریڈم تسلیم نہیں کرتا مغرب کی اصطلاح ''فریڈم'' کا وہ مطلب بھی نہیں ہے جو غامدی بیان کر رہے ہیں ڈیلوز تو مغرب کی فریڈم پر لعنت بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ سب جھوٹ ہے کہ ہمیں Freedom مل گئی ہے اگر یہ سچ ہوتا تو پھر آج ماں اور بیٹے، باپ اور بیٹی، بہن اور بھائی کے رشتے کیوں قائم ہیں ہم اگر برابر ہیں تو ان رشتوں کے مابین جنسی

تعلقات میں کیا رکاوٹ ہے وہ مغرب پر لعنت بھیجتا ہے کہ وہ ابھی تک Freedom کو حاصل نہیں کر سکا بے چارے غامدی صاحب کو فلسفے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ مغرب اور اسلام کو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلانے کے مدعی غامدی صاحب مغربی فکر وفلسفی کے بنیادی مباحث سے ناواقف ہیں لیکن اس کے باوجود دعویٰ ہے کہ دبستان شبلی قدیم وجدید علوم کا جامع ہے اور عالم اسلام کی قیادت اس جاہل، بلکہ اجہل، نالائق، نکمے مکتب فکر کا مقدر ہے۔ اس جھوٹ پر سوائے اس کے کیا کہا جائے۔ اس حادثہ وقت کو کیا نام دیا جائے؟

غامدی صاحب کے خود رو مکتب فکر کے کرنے کا کام

غامدی صاحب قرآن کے خلاف مستشرقین کے کام سے ناواقف

جناب جاوید غامدی اور ان کے مکتبہ فکر کا دعویٰ ہے کہ ان کا علم قرآن سے شروع ہوتا ہے اور قرآن پر ختم ہوتا ہے اور قرآن ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہر علم کی کلید اسی سے شروع ہوتی ہے اور اس پر ختم ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ اگر خلوص نیت اور ایمان کی پختگی کے ساتھ کیا جائے تو بلاشبہ سچا دعویٰ ہے لیکن غامدی صاحب کے مکتب فکر کا یہ دعویٰ محض لفاظی کے سوا کچھ نہیں۔ دنیا بھر میں مستشرقین قرآن کے خلاف مسلسل تاریخ وتحقیق کے انبار لگا رہے ہیں اور قرآن کو متنازعہ محرف، غیر عربی، غلط، متضاد افکار کا آمیزہ، چوتھی ہجری کا مرتبہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں لیکن اشراق کے تیس سالہ رسالے کی سولہ سالہ فائل اور غامدی صاحب کی تین سو تقاریر میں مستشرقین کی اس مہم جوئی پر اس حلقے کی خامشی حیرت انگیز ہے۔ علم وفضل کی مسند شبلی پر بیٹھنے کے دعوؤں کے ساتھ معائدین اسلام کی مہم جوئی سے غص بصر کا کیا مطلب ہے؟ غامدی صاحب کا پورا حلقہ، اس حلقے کا تمام سرمایہ، اس حلقے کی افرادی قوت صرف اور صرف اسلام اور مسلمانوں کو کم زور کرنے، اسلامی اقدار وروایات کو متنازعہ بنانے، اکابرین امت کی توہین، تذلیل، تردید پر صرف ہو رہی ہے۔ یہ دین کی خدمت نہیں۔ مغربیت جدیدیت اور امریکہ کی بہترین خدمت ہے جس کا یقیناً بہترین معاوضہ ملے گا اور مل رہا ہے۔ قرآن پر مستشرقین کے

حملوں کے سلسلے میں چند حوالے غامدی صاحب کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں تا کہ اگر وہ اہلیت رکھتے ہوں تو اس سمت میں مثبت کام کریں اور امت کو پارہ پارہ، ریزہ ریزہ کرنے کے بجائے مستشرقین سے پنجہ آزمائی فرمائیں۔

۱۔ www.geocities.com نامی ویب سائٹ سے "**ھل القرآن معلوم**" کے نام سے قرآن کے موجودہ نسخے کو محرف ثابت کرنے کے لیے تاشقند کے مصحف عثمانی سے موجودہ قرآن کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ نسخۂ تاشقند ڈاکٹر حمید اللہ فراہی پہلے ہی مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں لیکن اس ویب سائٹ کا کوئی جواب المورد، اشراق، رینے ساں کی جانب سے نہیں دیا گیا۔ مغرب کے ممتاز ترین مستشرقین [۱] John wansbrough, Michael Cook [۲] Martin Hinds [۳] Patricia Crone نے قرآن پر اعتراضات کرتے ہوئے مختلف سوالات اٹھائے ہیں۔ ان سوالات اور اعتراضات میں بہت سے سوالوں کا رد یا ان سے علمی و تحقیقی اختلاف مغرب کے دوسرے مستشرقین نے کیا۔ لیکن غامدی صاحب کے حلقے کے کسی رسالے کسی درس، کسی تقریر میں اس موضوع پر کوئی تحریر، تقریر نہ پڑھنے کو ملی نہ سننے کو جو افسوس ناک بات ہے۔ کعبہ کی حفاظت کے لیے پاسباں مغرب کے صنم خانے سے تو مل گئے، لیکن عالم اسلام کے صنم خانہ غامدی کا کوئی محقق اپنے علم کا پشتارہ لے کر مغرب کے مقابلے کے لیے نہیں نکلا، کیوں کہ ان میں اہلیت ہی نہیں ہے۔ یہ جدید کٹھ ملا ہیں جن کے پاس ٹوپی نہ پہننا، پاجامہ گھسیٹ کر چلنا، عورت کے سر سے چادر کو اتروانا، عورت مرد کے ہاتھ ملوانا، عورت مرد کو باتیں کرنے کی آزادی دلانا، ہم جنس پرستی کرانا، اہم عصری فقہی مسائل ہیں اور یہ جدید مُلا بے چارے قدیم مولویوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں کہ انھیں دنیا کا کچھ علم نہیں جب کہ قدیم مولوی الحمدللہ علم کردار اور معلومات میں ان جدید ملاؤں سے ہزار درجہ بہتر برتر اور افضل ہیں، ان جدید ملاؤں کو تو دین کا بھی پتہ نہیں ہے۔ یہ دنیا یعنی مغرب، جدید فلسفہ، سائنس ٹیکنالوجی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

[۳] المانوی ماہر لسانیات Christoph Luxen Berg نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن خالص عربی زبان میں نازل ہی نہیں ہوا۔ اس کا ۳۰ فیصد حصہ Syro Aramic زبان پر مشتمل ہے۔ اس لیے قرآن کے کچھ حصے ہمیشہ سے مفسرین کے لیے ناقابل فہم رہے۔ غامدی صاحب کا حلقہ اس ماہر سے بھی لاعلم ہے۔ مستشرقین کے اعتراضات پر غامدی صاحب کی خامشی کے دو اسباب ہو سکتے ہیں یا تو وہ اوران

کے شاگردان اعتراضات کا جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتے یا جواب دینا ہی نہیں چاہتے کہ مغرب میں قرآن پر سے کفار کا یقین اٹھا دیا جائے اور مشرق میں مسلمانوں کا اسلام اور اس کی تاریخ پر سے اعتماد ختم کر دیا جائے۔ ہمارے خیال میں دونوں اسباب درست ہیں۔

[۴] ایک اور جرمن اسکالر Gerd R. Puin نے یمن کی ایک قدیم مسجد سے ۲۵ سال پہلے ہزاروں بوسیدہ عربی صفحات حاصل کیے۔ پانچ سال تک ان صفحات کی عکس بندی اور ترتیب میں صرف ہوئے۔ لیکن ابھی کوئی بڑا کام سامنے نہیں آیا لیکن اس نے ابتدائی تحقیقات کے بعد ایک مختصر مضمون میں ان اوراق سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ Quran is a cocktail of texts غامدی صاحب اور ان کے حلقے نے اس افتراء کا جواب نہیں دیا۔

[۵] Hermunitics کے ذریعے قرآن کے نئے مفاہیم، مطالب، اشارات اخذ کرنے، وضع کرنے کی کوشش جرمنی میں زور وشور سے جاری ہے اور چند سالوں میں ایک ''جدید قرآن'' جرمنی سے شائع ہونے والا ہے۔ افسوس کہ جاوید غامدی صاحب کے حلقے میں فلسفے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ مغربی فلسفے کے عمیق مطالعے کے بغیر مغرب سے مقابلہ بھی ممکن نہیں۔ غامدی صاحب بھی فلسفے پر عبور نہیں رکھتے، ان کا علم فلسفہ نہایت سطحی ہے اپنی زندگی میں انھوں نے فلسفے پر صرف ایک مضمون حق و باطل کے نام سے لکھا ہے جو ان کی ویب سائٹ urdu.at-mawrid.org سے ۲ رمئی ۲۰۰۷ء کو حاصل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ان کی کتاب مقامات میں بھی شامل ہے۔ غامدی صاحب کی تمام تحریروں میں صرف ایک مغربی فلسفی ہیگل کا دوسطری حوالہ ہے وہ بھی غلط در غلط ہے۔ اس کی تفصیل اس شمارے کے دوسرے مضمون میں دیکھیے۔

[۶] ایک اور مغربی مفکر Christoph Burgmer سے بھی غامدی صاحب کا حلقہ ناواقف ہے۔ اس کی کتاب Streit umden Koran قرآن پر مغربی معاندانہ مطالعات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ وہ قرآن کے وجود کا تاریخی طور پر قائل ہے لیکن تفہیم قرآن کے لیے historio-liguistic finding کو اساس اور بنیاد بناتا ہے۔ وہ قرآن کو کلام اللہ قرار دیتا ہے۔ لیکن تاریخ کے سفر میں وہ کلام اللہ کے مطالب و مفاہیم کو بدلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس کتاب کا ناقدانہ جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کیونکہ غامدی صاحب خود اس فلسفے کو عالم اسلام میں عام کر رہے ہیں۔ آیات قرآنی کا مطلب نہ صحابہ کو

معلوم تھا نہ ائمہ اربعہ کو، نہ علماء صلحاء فقہاء امت کو اب تمام مطالب پندرہ سو سال کے بعد غامدی صاحب پر کھل رہے ہیں کہ یہود و نصاریٰ سے مراد اس زمانے کے تھے، اس زمانے کے یہود و نصاریٰ تو قرآن کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ یہ تو مومنین اور کاملین ہیں، ان سے کیا اختلاف یہ تو اہل خیر و حق ہیں۔

[۷] غامدی صاحب اور ان کا مکتبہ فکر Burgmer اور Christoph Luxenberg کے مکالمے The Koran as Philological mine کا مطالعہ فرمائیں تو ٹوپی سنت یا بدعت، ختنہ عورت کی ہو یا مرد کی، پائجامہ اونچا یا نیچا، اجتہاد کا حق کسے، صرف علماء کو یا ہر اسکالر کو، خدا ہے یا نہیں جیسے پامال موضوعات پر علمیت بگھارنا بھول جائیں وہ مسائل جوامت نے طے کر دیے جن پر تعامل امت ہے ان کو موضوع بحث بنانا اور مغرب کی یلغار، کفر کی تلوار، باطل کی للکار سے صرف نظر کرنا جدیدیت پسندوں کا خاص طریقہ ہے کیونکہ یہ سامراجی طاقتوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔

[۸] مشہور زمانہ Apostate ابن دراق جو امریکہ میں مقیم ہے اس کی کتاب "The Quest for HistoricalMohammad" اپنے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے جو رسالت مآبؐ کے بارے میں مغربی ذہنیت، وہاں کے ذہن اور رویے کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، اس کتاب میں وراق نے ان تمام مستشرقین مفکرین، محققین کے اہم اور چیدہ مقالے جمع کر دیے جو ذات رسالت مآبؐ اور اسلام کی تاریخیت پر نقد و جرح کرتے ہیں۔ مثلاً Henry Lammens، John Wohnsbrough، Patricia Crone وغیرہ وغیرہ۔ اس کتاب کے ذریعے Historicity of Islam and its text کو متنازعہ بنانے کی ناقص علمی تحقیقی تاریخی کوششیں کی گئیں ہیں۔ غامدی صاحب کے اہل قرآن اس سے بھی ناواقف ہیں۔

[۹] جناب غامدی صاحب کا پورا مکتبہ فکر اگست ۱۹۹۵ء میں Trinity College کیمبرج میں ڈاکٹر جمال بداوی اور مستشرقین کے مابین Is the Quran the word of God کے عنوان پر ہونے والے مکالمے سے بھی لاعلم ہے۔ اس موضوع پر بحث میں بے شمار مفکرین شامل ہوتے چلے گئے جن کی تفصیلات ویب سائٹ http://www.domini.org/debate/home.htm پر پڑھی جاسکتی ہیں، اس موضوع سے متعلق مزید معلومات کے لیے http://debate.org.uk/topics/history/debate/partI.htm#D سے رجوع کیا

جائے۔ غامدی صاحب کے مکتبہ فکر نے جسے فخر ہے کہ وہ عالم اسلام کا واحد مکتب فکر ہے جو قرآن میں ڈوب کر ابھرا ہے اور صرف وہی قرآن کی حقیقی روح، اس کی لغت اس کی عربیت پر عبور رکھتا ہے۔ قرآن کے خلاف ہونے والی عالمی سازش سے بالکل بے خبر ہے۔ یہ بے خبری نادانستہ نہیں دانستہ ہے۔ اس غض بصر کا صرف ایک ہی مطلب ہے مستشرقین وہی کام مغرب میں کریں جو غامدی صاحب، وحیدالدین خان، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر فتحی عثمان، ڈاکٹر رشید جالندھری، ڈاکٹر خالد مسعود، زاہد الراشدی، ڈاکٹر محمود غازی، علامہ یوسف قرضاوی عالم اسلام میں انجام دے رہے ہیں۔

مصر میں مفتی عبدہ، انگریزوں کے آلہ کار تھے اور انگریزوں نے عبدہ اور ان سے متاثر سیاسی جماعت کی سامراج کے لیے خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی تفصیل ساحل کے مارچ، اپریل، مئی ۲۰۰۵ء کے شماروں میں ملاحظہ فرمایے۔ ان شماروں میں عالم اسلام کے ہر حصے میں غامدی صاحب جیسے جدیدیت پسندوں کی تاریخ تحریر کی گئی ہے کہ جدیدیت پسند اسلام کے حصار میں کیسے نقب لگاتے ہیں۔ علامہ جمال الدین افغانی برطانوی اور روسی استعمار کی دہری خدمات انجام دیتے رہے۔ سرسید انگریزوں کے مسلمہ ایجنٹ تھے۔ مولوی چراغ علی، کرامت علی جونپوری، جسٹس امیر علی، [ہند کے وائسرائے کی سالی امیر علی کی بیوی تھی اس کی تفصیل فروری ۲۰۰۷ء کے ساحل میں پڑھیے] کلکتہ کے خدا بخش، سب استعماریت کی خدمت میں مصروف تھے۔ پاکستان میں ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر فضل الرحمان، ڈاکٹر رشید جالندھری، جعفر شاہ پھلواری، غلام احمد پرویز، جاوید غامدی امریکی اور مغربی استعمار کے فطری حلیف ہیں۔ اسی لیے ان تمام مفکروں اور دانشوروں کی ہر تحریر و تقریر میں اسلام کے خلاف مسلمہ مکاتب فکر کے خلاف بہت کچھ دلائل ملیں گے لیکن ان کی کسی ایک تحریر و تقریر میں مغرب، عالمی استعمار، یہودیت، عیسائیت، جدیدیت، ماڈرن ازم، کیپٹل ازم، لبرل ازم، وحدت ادیان، جمہوریت، جدید سائنس کی تباہ کاریوں کے بارے میں ایک لفظ، ایک حرف، ایک سطر نہیں ملے گا۔ کیونکہ یہ اجہل ان امور کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اور اگر کچھ غلط سلط جانتے ہیں تب بھی یہ مغرب کو الحق اور اس کی سائنس و ٹیکنالوجی کو الکتاب قرار دے کر اس میں کوئی نقص نہیں نکالتے صرف اس پر ایمان لے آتے اور مغرب کے سامنے سر بہ سجود ہو جاتے ہیں۔ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا۔

مستشرقین کی فکری یلغار کے چند نمونے اس لیے پیش کیے گئے ہیں کہ یہ غامدی صاحب اور

ان کے حلقے کے کرنے کے کام ہیں جن کو غرہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ عربی جاننے، انگریزی سمجھنے والے اہل علم ان کے حلقہ مفکرین میں داخل شامل ہیں۔ اسلام کے دشمنوں کے خلاف محاذ جنگ گرم کرنے کے بجائے اسلام کا دفاع کرنے والوں اور اسلام کو محفوظ طریقے سے امت تک منتقل کرنے والوں کے خلاف غامدی صاحب کا جہاد اکبران کے استعماری حلیف ہونے کی کھلی شہادت دے رہا ہے۔

جاوید غامدی اور حمید الدین فراہی آگ اور پانی کا موازنہ

ایک سنت و سادگی کا نمونہ دوسرا عیش و عشرت کا مرقع

داڑھی، تہمد، بیچ کی مانگ نکالنا فراہی کی نظر میں سنت ہے

فراہیؒ صاحب کی تحقیق کے مطابق پردہ فرض ہے

[ساحل اپریل میں آپ نے جاوید غامدی صاحب پر تنقید کرتے کرتے استاد الامام حمید الدین فراہیؒ پر بھی سخت تنقید فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فراہیؒ صاحب کا غامدی سے کوئی تقابل ہی نہیں ایک آگ ایک پانی ایک سنت کا نمونہ دوسرا عیش و عشرت کا مرقع دونوں کا طور۔ طرز زندگی، طرز فکر، عادات اطوار تک مختلف ہیں۔ آپ نے فراہی صاحب کو غامدی صاحب کے برابر لا کر فراہی صاحب کی توہین کی ہے اور ہماری دل آزاری غامدی صاحب پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے لیکن غامدی کا ملبہ مدرسہ اصلاح اور فراہیؒ پر نہ ڈالیے غامدی کا مدرسہ اصلاح یا فراہی سے کوئی تعلق نہیں وہ تو نفس پرست انسان ہیں جو قرآن کے الفاظ میں ''خواہش نفس کی پرستش میں مبتلا ہیں اور اپنے ہر کفر، نفاق، تحقیق فتوے کا ماخذ فکر فراہی کو بتا کر امت کو گم راہ کر رہے ہیں۔ فراہی صاحب پر یہ تحریر ذکر فراہی سے مرتب کی گئی ہے۔ زبید احمد اصلاحی]

مدرسہ اصلاح سادگی کا پیکر: المورد عیش و عشرت کی ثقافت

''مدرسہ کے یہ مدرسین جس سادگی، اخلاص اور ایثار کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کی مثال ہم کو کسی اسلامی درس گاہ میں نہیں ملتی، سب سے بڑی تنخواہ مدرس اعلیٰ مولانا شبلی صاحب ندوی کی

ہے، پینتیس روپے، درانحالیکہ ان کے پڑھائے شاگرداوران کے ساتھی اس سے دوگنی چوگنی زیادہ تنخواہ پارہے ہیں‘‘۔’’مدرسہ اصلاح میں کام کرنے والے چند مدرس نہایت ایثار پیشہ، بےغرض اور مخلص علماء ہیں، جن میں کچھ ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ اور کچھ خوداسی مدرسہ سے نکلے ہوئے ہیں۔ مدح وستائش نہیں واقعہ ہے کہ ان مدرسین نے مہینوں قوت لایموت پر گزر کر کےاور سالہاسال تنخواہ نہ پا کر اس اخلاص و ایثار کے ساتھ کام کیا ہےاوراب تک کررہے ہیں کہ ہمارے موجودہ قومیات میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔[ذکرفراہی، ص۴۸۹]

مولانا امین احسن اصلاحی، جوخود مدرسہ میں استادرہ چکے ہیں۔لکھتے ہیں:

’’اخلاص کا حال اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے مگرفقر ہمیشہ سے اس مدرسہ کی خصوصیات میں سے رہا ہےاوراسی فقر کے اندراس کے تمام کام ہوتے رہے ہیں۔‘‘

المورد والوں کی تنخواہوں کا تقابل الاصلاح والوں سے:

فقر کے ساتھ ایثار واستغنا مدرسۃ الاصلاح کا وصف امتیازی ہے جو باہر سے آنے والے کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہے۔فقر وہی ہے جس میں ذلت ومسکنت کے بجائے استغناءاور بے نیازی ہو۔اسی فقر کے بارے میں سرورِکونین نے’’الفقرفخری‘‘فرمایا۔مولانا فراہی نے مدرسہ کے لیے جومنشور بنایااس میں بصراحت مذکور ہے کہ یہاں کے اساتذہ تنخواہ کی توقع نہ رکھیں اور کفاف پرقناعت کریں اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا کا دیا ہوا یہ منشور مدرسہ کے لیے’’کلمہ باقیہ‘‘بن گیا۔سیدصاحب کے لکھنے کے مطابق شبلی ندوی کی تنخواہ جوصدر مدرس بھی تھےاور مہتمم بھی، ۱۹۳۱ء میں ۳۵ روپے تھی۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں جب میرا داخلہ ہوااس وقت بھی ان کی تنخواہ اتنی ہی تھی۔ پھربھی زمانہ سستائی کا تھا۔دوسری جنگ عظیم میں ایک دم گرانی اس طرح بڑھی کہ اس کی کوئی حد نہ رہی۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں اختر احسن اصلاحی کی تنخواہ ۵۵ روپے تھی، اس میں سے وہ پانچ روپے مدرسے کو چندہ دیتے تھے۔۱۹۷۹ء میں اس مدرسے کے اساتذہ کی کم سے کم تنخواہ ۱۷۳روپےاور زیادہ سے زیادہ ۲۱۷ روپے تھی، عربی درسگاہ کے اساتذہ کی تنخواہیں کم سے کم ۱۵۹ روپے اور زیادہ سے زیادہ ۲۸۸ روپے تھی۔ ہراستاد پانچ گھنٹے روزانہ پڑھاتا تھا۔[ذکرفراہی، ص۴۹۰]اس فقرسادگی للّٰہیت کا غامدی کے حلقے سے موازنہ کیا جائے۔المورد کے فیلو، محققین کی تنخواہیں ہزاروں روپے، شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ، گاڑی، پیٹرول، موبائل مفت اور غامدی صاحب کے عیش وعشرت

دیکھیے ان کا فراہی مکتب فکر سے کیا تعلق خدا کے لیے غامدی کے نام پر فراہی مکتب کو بدنام نہ کیا جائے۔ امین احسن اصلاحی نے تو اپنی زندگی کے آخری دور میں انھیں عاق کر دیا تھا۔ان کے اصل خلیفہ خالد مسعود تھے جو درویش آدمی تھے۔اگر غامدی صاحب فقیر ہوتے تو خلافت ان کو ملتی،مدرسہ میں سادگی کا عالم یہ ہے کہ ۳۰،۴۰ سال تک فی طالب علم ۴ روپے ماہانہ خوراک تھی۔۱۹۷۹ء میں یہ خرچ ساٹھ روپے ماہانہ تھا۔ دال روٹی ہفتے میں دو بار چٹنی یا گوشت ملتا تھا۔طالب علم کپڑے خود دھوتے،صفائی خود کرتے اور استری بھی خود کرتے ہیں۔

فراہی صاحب پردے کے قائل تھے:

بیگم نواب صاحبہ بھوپال کے استفسار کے جواب میں فراہی صاحب نے لکھا اجنبی سے پورا پردہ کرنا واجب ہے اور قرآن نے بھی حجاب واجب کیا ہے جو شرفاء میں مروج ہے بلکہ اس سے زائد ہے۔ ۱۷/۱۱کتوبر ۱۹۱۵ء [نقوش خطوط نمبر ۱۹۵۷ء] غامدی صاحب تو پردے کے قائل ہی نہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں پردہ کیا ہے یہ لفظ ہی غلط ہے۔اب ان کی عربی فراہی سے بہتر تو نہیں ہوسکتی۔امین احسن اصلاحی کی روایت کے مطابق امام فراہی کا فرمان تھا کہ:

''سورہ نور میں گھر کا پردہ ہے اور سورہ احزاب میں باہر کا پردہ ہے۔اسی اشارے سے میں نے پردے کے متعلق اپنی بحث کو پھیلا دیا ہے اسی طرح مولانا فراہی نے کہیں لکھا ہے کہ رجم سورہ مائدہ سے مستنبط ہوتا ہے۔اشارہ سورہ نور کی آیات ۳۹۔۳۰،احزاب ۵۹ اور مائدہ ۳۳ کی طرف ہے۔[ذکر فراہی،ص ۸۶۸]

مولانا امین احسن اصلاحی نے مجھ سے بیان کیا۔

اس کو عیب کہیے یا ہنر مولانا فراہی کو اس کی پرواہ مطلق نہیں ہوتی کہ ان کی بات کوئی سمجھے گا یا نہیں۔وہ اشارات میں بات کہنے کے عادی ہیں۔پردے کے متعلق انہوں نے کہیں صرف اس قدر لکھا ہے کہ سورۂ نور میں گھر کا پردہ ہے۔اور سورۂ احزاب میں باہر کا پردہ ہے۔مسلسل غور کے بعد میں کہیں جا کر اس اشارے کو سمجھا اور پردے کے متعلق اپنی بحث کو اسی بنیاد پر پھیلایا۔اسی طرح مولانا فراہی نے کہیں یہ بھی لکھا ہے یا کبھی زبانی گفتگو میں کہا کہ رجم سورۂ مائدہ سے مستنبط ہوتا ہے۔[ذکر فراہی،ص ۸۶۸]

غامدی صاحب تو اب پردہ کے قائل نہیں وہ سر پر اوڑھنی کو بھی غلط سمجھتے

ہیں کہتے ہیں کہ پردہ کا لفظ ہی غلط ہے بے چارے اللہ نے پردے کا لفظ استعمال نہیں کیا مولوی پردہ پردہ کررہے ہیں یہ لفظ ہی غلط ہے جبکہ امام فراہی نے خود پردے کا لفظ استعمال کیا امام اصلاحی پردے کے قائل تھے غامدی صاحب اصلاحی وفراہی سے بڑے عالم نہیں نہ ہی ان کی عربی اصلاحی وفراہی سے اچھی ہے نہ ہی ان کا علم اور قرآن پر نظر دونوں سے بہتر ہے دونوں پردے کے قائل تھے اصلاحی صاحب کی کتاب ''پاکسانی عورت دوراہے پر'' پڑھ لیجیے۔

داڑھی کے بارے میں مولانا فراہیؒ کا نقطہ نظر:

فاروق نعمانی کا بیان ہے کہ میں ان دنوں کلین شیو رہتا تھا۔ ایک دن مولانا میرے کمرے میں آئے۔ کریم کی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ پوچھا یہ کیا ہے میں نے بتایا کہ کریم جو شیو کے بعد چہرے پر لگاتے ہیں۔ مولانا نے کہا ''اپنا چہرہ دیکھو اور میرا چہرہ دیکھو''۔ ان کی اس بات کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں نے اس دن سے کریم لگانا چھوڑ دیا۔ [ذکر فراہی، ص ۵۲۶]

مولوی ضیاء الدین اصلاحی نے مولانا اختر احسن اصلاحی سے سنی ہوئی ایک روایت مجھ سے یہ بیان کی کہ موضوع بمہور [مولانا امین احسن اصلاحی کا گاؤں] کے دو نوجوان انیس اور الیاس جو آپس میں بھائی تھے مدرسے پر آئے، ان میں سے بڑے بھائی کی داڑھی تراش خراش کی وجہ سے چھوٹی تھی جب کہ چھوٹے بھائی کی داڑھی لمبی تھی۔ مولانا شرعی وضع کے معاملے میں بہت ذکی الحس تھے۔ وہ ڈاڑھی کی کتر بیونت تک کو ناپسند کرتے تھے۔ مزاحاً انھوں نے پوچھا کہ ان دونوں میں بڑا کون ہے۔ حاضرین نے بتایا کہ یہ بڑے ہیں۔ مولانا نے فرمایا یہ کیسے بڑے ہیں؟ یہ نہیں وہ بڑے ہیں۔ مولانا کا اشارہ چھوٹے بھائی کی طرف تھا جن کی ڈاڑھی بڑی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بڑا وہ ہے جس کی ڈاڑھی بڑی ہے۔ ظاہراً معلوم بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ بڑی ڈاڑھی والا آدمی بڑا لگتا ہے۔ طعن وتشنیع کے بجائے جس میں دلآزاری ہوتی ہے اور جس سے ضد پیدا ہوتی ہے مولانا چاہتے تھے کہ لطیف پیرایے میں اپنی بات کہہ دیں تاکہ اصلاح ہو۔ [ذکر فراہی، ۵۲۶]

فراہیؒ صاحب داڑھی کو سنت سے بڑھ کر سمجھتے تھے:

ذکر فراہی کے مصنف کے مطابق ''ڈاڑھی بھی ان امور میں سے ہے جن کا ذکر مولانا کے حالات میں کثرت سے آتا ہے۔ ڈاڑھی کی شرعی حیثیت اور دین میں اس کی اہمیت کے بارے میں بہت

کچھ لکھا اور کہا گیا ہے۔ ڈاڑھی کے متعلق مولانا ابوالکلام کا ایک جملہ بہت مشہور ہے کہ ''اسلام میں ڈاڑھی ضرور ہے مگر ڈاڑھی میں اسلام نہیں''۔ فقہی اعتبار سے جو رائیں اور فقرے ہیں ان کی اپنی جگہ ہے۔ لیکن اس بارے میں مولانا فراہی کا اپنا نقطہ اور طرز عمل ایک دم الگ معلوم ہوتا ہے جو امور دین میں ان کے مجموعی رویے سے ہم آہنگ ہے۔ اس مسئلہ پر مولانا اصلاحی اور مولانا فراہی کے مابین جو گفتگو ہوئی وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مولانا اصلاحی لکھتے ہیں۔

''اسی طرح ایک مرتبہ ڈاڑھی کے مسئلہ پر بھی بحث چھڑ گئی۔ مولانا دین میں اس کی اہمیت واضح کر رہے تھے اور میں ان کے سامنے یہ بات پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دین میں ڈاڑھی کی فی الواقع وہ اہمیت نہیں ہے جو اس کو دی جارہی ہے۔ مولانا کچھ دیر تک تو مجھے ان احادیث کا مطلب سمجھاتے رہے جو اس بارہ میں وارد ہیں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ میں ڈاڑھی کی اہمیت کا کسی طرح قائل نہیں ہو رہا ہوں تو فرمانے لگے کہ ''اچھا فرض کیا کہ اس کی دین میں بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن کیا اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ یہ چھوٹی سی چیز بہت بڑی بڑی چیزوں کا پتہ دیتی ہے؟'' میں نے عرض کیا وہ کیسے؟ فرمایا ''جس طرح راکھ کی ایک چٹکی اڑا کر ہم ہوا جیسی عظیم الشان چیز کا پتہ چلا لیتے ہیں کہ اس کا رخ کدھر کو ہے اسی طرح ایک شخص کے چہرے پر ڈاڑھی کے ہونے اور نہ ہونے سے ہم یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کا میلان کس طرف ہے، اسلام کی طرف یا غیر اسلام کی طرف؟'' مولانا کے اس جواب کے بعد میں خاموش رہ گیا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ڈاڑھی چاہے دین میں بجائے خود بہت زیادہ اہمیت رکھنے والی چیز نہ ہو لیکن جہاں تک ایک مسلمان کا تعلق ہے یہ اس کے دل کے رجحانات کے لیے ایک بیرومیٹر [Barometer] کا کام ضرور دیتی ہے اور اگر یہ بات ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دین میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور ہونی چاہیے۔ [ذکر فراہی، ص ۸۴۴]

ڈاڑھی کے سلسلے میں ڈپٹی عبدالغنی ساکن جیگہاں کا یہ واقعہ ایک نہیں متعدد ذریعوں سے میں نے سنا۔ مولانا اختر احسن کے صاحبزادے مولوی غالب اصلاحی استاذ مدرسۃ الاصلاح، امین الدین صاحب ساکن شہر اعظم گڑھ اور مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین نے مجھ سے بیان کیا۔

غامدی صاحب کے اکثر ساتھی داڑھی منڈے ہیں:

مولانا فراہی داڑھی منڈوں سے ہاتھ نہیں ملاتے تھے:

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ڈپٹی عبدالغنی نے مولانا فراہی سے ہاتھ ملانا چاہا تو انھوں نے ان کی غیر شرعی وضع کی وجہ سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ وہ ڈاڑھی منڈاتے تھے اور کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ یہ تو مولانا فراہیؒ کی غیرت، حمیت اور شدت کا حال تھا۔ **دوسری جانب غامدی صاحب کی المورد کی شوریٰ میں اکثر داڑھی منڈے ہیں. داڑھی کی ضرورت کے غامدی صاحب کسی صورت میں قائل نہیں ہیں. اب غامدی صاحب اور فراہی کا تقابل آپ خود کرلیجیے۔** جیسا کہ اصلاحی صاحب کے بیان سے واضح ہوتا ہے۔ مولانا ڈاڑھی کے معاملے میں زیادہ ذکی الحس تھے۔ ڈپٹی عبدالغنی صاحب کے ساتھ آزردگی کی بعض دوسری وجہیں بھی تھیں۔ ڈپٹی صاحب سود کو جائز سمجھتے تھے۔ ممکن ہے اس زمانے میں صوم وصلاۃ کی پابندی سے بھی آزاد رہے ہوں۔

ایک راوی مولوی عبدالسلام ساکن پھریہا نے میری فرمائش پر اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا۔ وہ کہتے ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ مولانا فراہی سرائے میر تشریف لے جا رہے تھے۔ گاڑی کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ اسٹیشن کی بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ اس زمانہ میں پورب اور پچھّم سے آنے والی دونوں ٹرینوں کا میل پھریہا میں ہوتا تھا۔ اس دن پچھّم والی ٹرین ذرا پہلے آگئی۔ اس ٹرین سے ڈپٹی عبدالغنی انصاری اترے۔ مولانا کو دیکھ کر فوراً ان کی طرف بڑھے۔ انھوں نے سلام کیا۔ مولانا نے جواب دیا۔ عبدالغنی صاحب نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مولانا نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا میں ڈاڑھی منڈوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ عبدالغنی صاحب بہت چیں بہ جبیں ہوئے اور طیش میں آ کر بولے۔ مولانا آپ نے مجمع عام میں مجھے ذلیل کیا۔ اگر آپ کو تنبیہہ ہی کرنی تھی تو کسی وقت تنہائی میں سمجھا دیتے۔

داڑھی نہ رکھنے والا قیامت میں رسوا ہوگا: فراہیؒ

مولانا کا اصول تھا کہ جب کوئی مخاطب ہوتا تو خاموش رہتے تھے۔ جب متکلم خاموش ہوجاتا تھا تب مولانا جواب دیتے تھے۔ عبدالغنی صاحب کی گفتگو ختم ہوگئی اور ان کے دل کا غبار نکل گیا تو ہم اس انتظار میں تھے کہ اب مولانا ڈاڑھی کی اہمیت پر شرعی نقطہ نظر سے روشنی ڈالیں گے اور لمبی چوڑی تقریر فرمائیں گے لیکن مولانا نے جواب میں صرف دو جملے فرمائے۔ انھوں نے کہا عبدالغنی تمہاری تقریر کا

خلاصہ یہی تھا کہ بھرے مجمع میں تمہاری رسوائی ہوئی۔لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ ایک دن آنے والا ہے جب اس سے کہیں بڑا مجمع ہوگا اور اس سے کہیں زیادہ رسوائی ہوگی۔[ذکر فراہی،ص ۸۴۵] **مولانا فراہی کو یقین تھا کہ داڑھی سنت ہے شعار انبیاء ہے، اسلامی تہذیب و معاشرت کی علامت ہے سلیم اور صالح فطرت کی آواز ہے جو اس سنت سے گریز کرے گا وہ میدان حشر میں رسوا ہوگا غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ داڑھی کا رسوائی سے کوئی تعلق نہیں ایسے شخص کو آپ فراہی کے ساتھ ملا رہے ہیں.**

فراہیؒ صاحب نے داڑھی منڈے کوقرآن پڑھانے سے انکار کر دیا:

ڈاڑھی کے مسئلے میں اسی قسم کی ایک روایت مولوی ضیاء الدین اصلاحی نے مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کے واسطہ سے بیان کی کہ اقبال سہیل نے ایک بار مولانا سے کہا مولانا مجھے قرآن مجید پڑھا دیجیے۔اقبال سہیل نے اس زمانے میں ڈاڑھی منڈانی شروع کر دی تھی۔مولانا نے جواب میں فرمایا پہلے اپنی صورت ٹھیک کیجیے۔مجھ سے سید صباح الدین عبدالرحمان نے بیان کیا۔انھوں نے شاہ معین الدین احمد ندوی سے سنا۔

''مولانا فراہی حج سے واپس آئے تو ترکوں کی نسبت اچھے تاثرات کا اظہار کیا۔فرمایا ''میں ان ڈاڑھی منڈوں کی قوت ایمانی دیکھ کر متاثر ہوا''۔ترکوں سے اگر متاثر ہوئے جیسا کہ راویوں کا بیان ہے تو ان کی دوسری خوبیوں کی وجہ سے۔ڈاڑھی منڈانا اسی طرح ترکوں کے لیے بھی عیب تھا جس طرح دوسروں کے لیے۔یہی وجہ ہے کہ مولانا نے ان کی تعریف کرنے یا ان کے ساتھ اپنی خوشی کا اظہار کرنے میں بھی ان کے لیے ''ڈاڑھی منڈوں'' کا لفظ استعمال کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی قباحت ان کی نظر میں کم نہیں ہوئی تھی۔[ذکر فراہی، ۸۴۶، ۸۴۷] **یہ حال تو مولانا فراہی کا تھا کہ داڑھی منڈوں کو قرآن تک پڑھانے کے روادار نہ تھے جب کہ غامدی صاحب پر کٹی حجاب سے بے پروا، نیم عریاں لباس میں حسن کے جلوے دکھانے والی عورتوں کو دین کی حکمت اس حکمت کا صغری کبریٰ سکھا رہے ہیں ایک طرف فراہی کا تقویٰ نیکی، صالحیت، علم اور تدین ہے. دوسری طرف غامدی صاحب کی بے دینی آوارگی، آزاد خیالی اور دین کی اقدار سے دوری ہے پھر بھی ساحل**

غامدی کو فراهی صاحب کے شانه بشانه کھڑا کر رها هے یه ظلم هے۔

فراہی کے بیٹے پوتے کبھی مدرسہ کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہوئے:

ذکر فراہی کے مصنف شرف الدین اصلاحی کے مطابق مولانا کے بیٹے سجاد نے مولانا فراہی کے طریقے کے مطابق میری جوٹھی پلیٹ روٹی کے ٹکڑوں سے صاف کی اور کھا گئے۔ مجھے حکم دیا جاتا تو بھی میں اپنے والد کی جوٹھی پلیٹ اس طرح صاف نہ کرتا جس طرح سجاد صاحب نے اپنے والد کی پیروی میں میری جوٹھی پلیٹ صاف کی یہ تربیت تھی فراہی کی وہ خود مہمان کی تکریم اس طرح کرتے تھے۔ سجاد صاحب عملاً دیندار آدمی تھے۔ انھوں نے شروع سے شرعی وضع کی پابندی کی۔ ڈاڑھی رکھتے تھے، حج کر آئے تھے۔ نماز پڑھتے تھے، روزہ رکھتے تھے، اوامر بجالاتے تھے نواہی سے بچتے تھے اور جیسا کہ آگے چل کر ہم بیان کریں گے جہاں تک ہوسکا مولانا نے اپنے لڑکوں کی تربیت اسی نہج پر کی تھی۔ مولانا کے چھوٹے صاحبزادے صاحب کا انتقال ۴ر جنوری ۱۹۷۳ء کو پھریہا میں ہوا۔ میری ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ جس زمانے میں مدرسۃ الاصلاح کا طالب علم تھا کبھی کبھی ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا، وہ مدرسہ پر آتے رہتے تھے۔ شاید مدرسہ سے ان کا کوئی رسمی تعلق بھی تھا۔ دیندار وضع کے آدمی تھے۔ وہ سجاد صاحب کی نسبت زیادہ پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ جس طرح صورت میں سجاد صاحب مولانا سے مشابہت رکھتے تھے، میرا اندازہ ہے کہ سیرت میں عباد صاحب کو مولانا سے بہرۂ وافر ملا تھا۔ مولانا کے پوتوں حمد اللہ۔ عبید اللہ نے عربی پنجم تک مدرسۃ الاصلاح میں پڑھا۔ اس کے بعد سرکاری تعلیم کی طرف گئے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آج کل لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر ہیں۔ سعد اللہ نے کچھ وقت مدرسۃ الاصلاح اور ندوہ میں گزارا۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کیا اور صحافت کی طرف چلے گئے۔ آج کل دعوت دہلی سے منسلک ہیں۔ حمد اللہ کچھ دن مدرسۃ الاصلاح میں رہ کر جامعۃ الفلاح چلے گئے جہاں سے انھوں نے سند فراغت حاصل کی، پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل کا امتحان پاس کر کے طبیہ کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ کئی سال ہوئے علی گڑھ سے فراغت کے بعد عملی زندگی کی جدوجہد میں شامل ہو چکے ہیں۔ [ذکر فراہی، ص ۶۷۰] یہ کردار اسوہ حضرت فراہیؒ کا ہے جب کہ دوسری جانب دنیا دار غامدی صاحب کا کردار دیکھیے۔ اشراق کی مجلس مشاورت میں اپنی بیٹی بیٹے اور بچوں کو شامل کر دیا ہے سات سال اور چودہ سال کی لڑکی لڑکے سے کیا مشاورت ممکن ہے؟

غامدی صاحب کے یہاں ملوکیت کا پورا اہتمام: شیر خوار بھی مشیر ہے

غامدی صاحب نے فراہی صاحب کی زندگی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے کسی بیٹے، بیٹی، پوتے، پوتی کو مدرسہ اصلاح کی مجلس انتظامی میں کبھی شامل نہ کیا، نہ ان کے بچوں کا روزگار کبھی اس مدرسے سے وابستہ رہا نہ ہی فراہی صاحب کے کسی بیٹے بیٹی کو ''الاصلاح'' رسالے کی مشاورت میں شامل کیا گیا نہ زندگی میں نہ مرنے کے بعد۔ لیکن غامدی صاحب نے استاد امام الفراہی کے برعکس اشراق جیسے دینی پرچے کی مجلس مشاورت میں اپنے آٹھ سالہ بچے جنید غامدی کو جب وہ پانچویں جماعت کا طالب علم تھا شامل کر دیا۔ میٹرک میں پڑھنے والی اپنی صاحبزادی امیمہ مریم کو بھی اس دینی رسالے کی مجلس مشاورت میں جبراً داخل کر دیا گیا۔ معاذ غامدی اور جواد احسن غامدی بھی مجلس اشراق کی مجلس مشاورت میں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک صاحبزادے جنھوں نے ایم بی اے کیا تھا اور ٹی وی جرنلزم کا ایک دن کا تجربہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ انھیں جیو نے نہایت بھاری مشاہیرے پر بغیر کسی تجربے کے پروڈیوسر کا تقرر نامہ دیا اور ان کے والد محترم کے پروگرام غامدی کا پروڈیوسر بنا دیا۔ دنیا اولاد کے ذریعے کتنی خوش نما بنا دی گئی ہے۔

کیا یہ بچے مشاورت کی اہلیت رکھتے ہیں، جمہوریت کے دم بھرنے والے ملوکیت کو برا بھلا کہنے والے غامدی صاحب نے اپنے چاروں بچوں کو ایک مذہبی رسالے میں شامل کر کے ملوکیت کی رسم کو زندہ کر دیا ہے ان کا فراہی کی عظمت سے کیا تعلق؟ یہ چاروں نہ عربی جانتے ہیں نہ اسلام، ایک صاحب زادے نے تو حیدر آباد سے بی اے کا امتحان دیا کیوں دیا کیسے دیا ایک الگ افسانہ ہے۔ دانش سرا حیدر آباد والے اس افسانے کے کرداروں سے بخوبی واقف ہیں۔ اسلامی تحقیقی رسالوں کی تاریخ میں ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ کسی مدیر نے اپنی کمسن، نابالغ، ناسمجھ، لاعلم، جاہل اولاد کو ایک علمی و تحقیقی پرچے کی مجلس مشاورت میں شامل کر دیا ہو صرف اس لیے کہ یہ رسالہ ایک بڑی جاگیر کی صورت اختیار کرنے والا ہے لہٰذا بچوں کو اس جاگیر پر قابض کر دیا جائے۔ دنیا میں ملوث یہ مفکر اپنے آپ کو فراہی صاحب کا جانشین کہتے ہیں جو رئیس ابن رئیس ہوتے ہوئے بھی سادہ ترین زندگی بسر کرتے تھے۔ مہمانوں کی جوٹھی رکابی پونچھ کر صاف کرتے تھے۔

حمید الدین فراہی تہجد کو سنت سمجھتے تھے:

تہمد یا تہبند جس کو اعظم گڑھ کی بولی میں لنگی کہتے ہیں مولانا فراہی کی داستان حیات کا ایک عنوان بن گیا۔ مولانا فراہی تہمد پہنتے تھے۔ سب سے پہلے تو رسم دنیا کو دیکھتے ہوئے مولانا جیسے رئیس فاضل اجل کا تہمد باندھنا ہی ناقابل تصور نظر آیا۔ خود مجھ کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی جب پہلی بار میرے علم میں آئی۔ تہمد اہل مدرسہ میں تو زیادہ اجنبی نہیں لیکن جدید تعلیم یافتوں میں اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ مولانا رئیس ابن رئیس ہونے کے علاوہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے ان متخرجین میں سے تھے جن کو سابقون الاولون ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ فی زمانہ لنگی کو دیہاتیوں کا گنوارو لباس سمجھا جاتا ہے اس لیے مولانا کے حالات میں اس کا ذکر سننے کے لیے ذہن سرے سے تیار نہ تھا۔ لیکن جب اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا سنت سمجھ کر ہر نماز پابندی سے لنگی میں ادا کرتے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے مختلف ملاقاتوں میں ایک سے زائد مرتبہ مجھ سے بیان کیا۔

''تہمد ہمیشہ فراہی صاحب کے سرھانے تکیے کے نیچے دھری رہتی تھی۔ نہیں معلوم کیوں نماز کے وقت پابندی کے ساتھ تہمد ضرور باندھتے تھے اور نماز سے فارغ ہو کر فوراً تہمد اتار کر پاجامہ پہن لیتے تھے، تہمد کے اوپر ہی شیروانی پہن لیتے تھے جو بہت خوبصورت لگتی تھی اور گلے میں مفلر لگا لیتے تو اور بھی بھلے لگتے تھے۔ مولوی عبدالباری صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ مولانا کے کندھے پر ایک لنگی ضرور رہتی تھی اور کندھے پر لنگی کا رکھنا بھی مولانا پر سجتا تھا۔ کم از کم ان کی ذات کے لیے اس میں بدنمائی کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ اس بات کی تصدیق مولوی صاحب نے بھی کی کہ وہ نماز کے وقت تہمد ضرور باندھ لیا کرتے تھے۔''

[ذکر فراہی، ۸۱۶۔۸۱۷] **غامدی صاحب پہلے فراہی کے تتبع میں تہمد باندھتے تھے اب اسے گنوار پن سمجھتے ہیں. یہ حضرت فراہیؒ سے زیادہ مہذب، زیادہ عالم اور قرآن کے زیادہ شنادر ہیں۔**

حمید الدین فراہی کی حمیت دینی:

دین پر ادنٰی اعتراض سن کر جوش سے بھر جاتے تھے۔ میں نے خود اپنے دور الحاد میں بارہا ان کی ڈانٹ کھائی ہے۔ ایک دن خود مولوی شبلی صاحب نے [جو آخر میں خود بھی بہت درست ہو گئے تھے] قرآن مجید کے متعلق شوخی سے گفتگو کی تھی، مولانا حمید الدین کو گویا بخار چڑھ آیا اور جب تک مفصل تردید نہ کر لی چین سے نہ بیٹھے۔ ''غیرت دینی کے پتلے تھے، مولانا شبلی کبھی کبھی ہنسی ہنسی میں یا فرط شوخی سے

مذہب پر چوٹ کر جاتے، مولانا فراہی کو اس کی ذرا برداشت نہ تھی۔ سنجیدگی سے جواب میں مقالہ یا رسالہ لکھ ڈالتے، اور جب تک لکھ نہ لیتے، محسوس ایسا کرتے کہ جیسے بخار چڑھ آیا ہو'۔ مولانا فراہی کے گاؤں کے ایک دیہاتی بزرگ نے مجھ سے اپنا یہ واقعہ بیان کیا۔

''میں اپنا کھیت دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا۔ ہمارے گاؤں کے کچھ اہیر دسہرا کا میلہ دیکھنے بگھورا جا رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ ہو گیا۔ ہم مولانا کے دروازے سے گزرے۔ دوپہر ڈھلنے کا وقت تھا۔ مولانا مرحوم گھر کے باہر کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ دعا سلام کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا سعید تم کہاں جا رہے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ اپنا کھیت دیکھنے چوراہے تک جا رہا ہوں۔ مولانا نے ہدایت کی کہ تم دوسرے راستے سے جاؤ، ان لوگوں کے ساتھ مت جاؤ، ورنہ تمہارے اوپر بھی عذاب ہوگا۔ چنانچہ میں نے اپنا راستہ بدل دیا اس لیے کہ واقعی میں اپنا کھیت ہی دیکھنے جا رہا تھا۔''

مولانا کی نصیحت کا محرک کیا تھا۔ انھوں نے اتنی چھوٹی سی بات کا اتنی سختی سے نوٹس لیا۔ اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی دینی حس بیدار ہو۔ ورنہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں میلے ٹھیلے کے شوقین مسلمان بلا جھجک دسہرا دیکھتے ہوں مولانا کی یہ نصیحت عجیب نظر آئے گی۔ [ذکر فراہی، ص ۸۳۲] **دوسری جانب غامدی صاحب سے جس میلے ٹھیلے کا پوچھیے دین میں فطرت میں ثابت کر دیں گے بسنت ہو دیوالی ہو، ہولی ہو سب حلال ہے۔ غامدی صاحب کا فراہی سے کوئی تعلق نہیں۔**

فراہی ہر قسم کے سود کو حرام سمجھتے تھے:

علامہ شبلی نے لکھا ''بنک کا سود میرے نزدیک جائز ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا فتوی اس کے متعلق چھپ گیا ہے''۔

شبلی کے خیال میں ہندوستان نہ دارالحرب ہے نہ دارالاسلام بلکہ دارالامن ہے۔ اور دارالامن کے حوالے سے سود کے بارے میں ان کا نقطہ نظر ان کے ایک خط سے واضح ہوتا ہے۔ مولوی ابو ظفر ندوی کو لکھتے ہیں۔

''دارالامن کے احکام میں تنوع ہے، یعنی وہاں ہجرت واجب نہیں اور نہ جہاد جائز ہے۔ لیکن

ربا جائز ہے۔جس طرح لاربا بین الحربی والمسلم ۔لیکن دبستان شبلی سے تعلق رکھنے کے باوجود مولانا فراہی سود کی ہر قسم کو حرام سمجھتے تھے اور سود کا چندہ وصول نہ کرتے تھے۔ وہ شبلی نعمانی کی جدیدیت پسندی کے خلاف تھے۔شبلی نے ترکوں کے لیے چندے کی خاطر عید قرباں کی قربانی کو ساقط کرنے کا فتوی دیا تھا کہ کیا مسلمان کی جان مینڈھے سے سستی ہے۔فراہی صاحب نے اسے بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ان کا موقف تھا کہ مسلمان کی مدد وحمایت ونصرت فرض ہے۔فرض الگ ہے سنت الگ فرض کی ادائیگی کے لئے سنت کا ترک کیوں؟ فرض بھی ادا کرو سنت بھی مسلمان صاحب حیثیت صرف ایک بکرے، گائے کے برابر چندہ کیوں دے لوگ شادی، گھر، سواری، عیش پر بھاری اخراجات کرتے ہیں جو نفل ہے نہ مستحب تو وہ رقم چندے میں دینے کا فتویٰ دیا جائے، سنت کے انہدام پر فتویٰ یا اجتہاد بدعت ہے۔اس طرح کے فتوے دین کو مضحکہ بناتے ہیں جو چاہے کھڑے ہو کر سنتوں کو ساقط کر دے تعامل امت فتوے سے ساقط نہیں ہوسکتا نہ سنت کو فتویٰ رد کرسکتا ہے۔فراہی صاحب کے ایک عزیز شاگرد اقبال سہیل نے ''حقیقة الربوا'' نام کی ایک کتاب لکھی جو انہی دنوں چھپ گئی تھی۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ڈپٹی عبدالغنی انصاری کی فرمائش اور تحریک پر انھوں نے یہ کتاب لکھی اور اس میں ربوٰ کی حلت پر دلائل دیے۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب اپنے ایک تحقیقی کارنامے کے طور پر مولانا فراہی کی خدمت میں پیش کی جب کہ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اس طرح کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ناشر نے دیباچے میں کہیں ہلکا سا اشارہ اس طرف کیا ہے کہ مصنف شبلی اور فراہی جیسے علماء و محققین کا فیض یافتہ ہے۔مولانا کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت برہم ہوئے۔داڑھی منڈانے پر وہ پہلے ہی سہیل صاحب سے ناراض تھے، یہ خلاف شرع کام دیکھ کر ان کی برہمی میں اور اضافہ ہوا۔مولانا وکالت کے پیشے کو بھی ناپسند کرتے تھے اور اس سے زیادہ جج کے پیشے کو۔سہیل صاحب وکالت کرتے تھے۔انھوں نے اقبال سہیل کو بری طرح ڈانٹا۔اس سلسلے کے بعض جملے جو لوگوں نے نقل کیے۔''حرام کھا کھا کر تمہارا قلب سیاہ ہوگیا ہے۔تمہاری فطرت مسخ ہوگئی ہے ......وغیرہ''عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کا بیان ہے کہ اقبال سہیل نے والد صاحب [مولوی محمد شفیع] کو بیچ میں ڈال کر مولانا سے معافی تلافی کی کوشش بھی کی۔ **حقیقه الربوٰ** راقم الحروف نے نہیں دیکھی مگر مولوی بدر الدین صاحب نے بتایا کہ وہ کتاب کا مطبوعہ نسخہ دیکھ چکے ہیں۔مشہور شاعر اقبال سہیل صاحب وکیل اعظم گڑھ نے سود کے جواز پر ایک کتاب لکھی اور اپنا فخریہ کارنامہ سمجھ کر مولانا کو پیش کیا۔مولانا نے سخت

ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اقبال سہیل کو ملامت کی اور کہا جھوٹ کا پیشہ اختیار کیا، حرام کو حلال ثابت کرنے کا غلط کام کیا اور اپنی ذہانت برباد کی۔ [ذکر فراہی، ص ۸۴۱۔۸۴۲] غامدی صاحب نے تو شیرازی گروپ کی قائم کردہ سرمایہ کار کمپنی کی مشاورت قبول فرمالی ہے اور پاکستان میں تمام سرمایہ کار کمپنیاں صرف اور صرف سودی کام کرتی ہیں خواہ نام اسلامی رکھ لیں۔

فراہی صاحب بیچ کی مانگ نکالنا سنت سمجھتے تھے غامدی صاحب اسے بدعت کہتے ہیں:

شرف الدین اصلاحی نے سجاد صاحب سے روایت کیا ہے کہ فراہی صاحب سر کے بال قدرے لمبے رکھتے تھے۔ سجاد صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا جیسے کہ آپ کے ہیں۔ لیکن مانگ سر کے بیچ سے سیدھی نکالتے تھے، اتباع سنت کے خیال سے۔ ایک دن میور کالج الہ آباد کے پروفیسر نامی نے مذاق میں کہا آپ اس طرح کے بال کیوں رکھتے ہیں۔ استرے سے کیوں نہیں منڈاتے۔ مولانا نے جواب میں کہا۔ پھر سنت پر عمل کس طرح ہوگا۔ مقصد یہ تھا کہ بال نہیں ہوں گے تو مانگ کیسے نکالی جائے گی۔ نامی صاحب نے کہا پھر پٹا رکھ لیجیے۔ مولانا نے کہا اس سے شیروانی کے کالر خراب ہوں گے۔ نامی صاحب مولانا کے ماتحت اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ [ذکر فراہی، ص ۸۴۰، ۸۴۷] غامدی صاحب داڑھی کو سنت نہیں مانتے اور بیچ کی مانگ کو بدعت، اور فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں سنتوں کا مذاق اڑاتے ہوئے ایک مرتبہ میرے سوال کے جواب میں کہنے لگے کہ گھوڑے پر سواری کی جتنی سنتیں حدیث میں آئی ہیں ان پر عمل کرتے کرتے گھوڑا نکل جائے گا سوار رہ جائے گا یہ سب خرافات ہے فراہی صاحب سے تلمذ کا موقع نہ ملا ورنہ یہ اسرار ان پر کھول دیتا۔

مولانا فراہی فتویٰ دینے سے احتراز فرماتے تھے اور غامدی صاحب روز فتوے:

علم دین میں مجتہدانہ بصیرت رکھنے کے باوجود مولانا فراہی فتویٰ دینے سے احتراز کرتے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے مجھ سے بیان کیا۔

''مولانا حمید الدین سے کوئی فتویٰ پوچھتا تھا تو کہتے تھے کہ مدرسہ پر جائیں گے تو مولوی لوگوں سے پوچھ کر بتائیں گے''۔

مولانا ذمہ داری سے بچنے کے لیے ٹالتے تھے یا خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ فتویٰ دینا ایک فن ہے۔ علم کے ساتھ جب تک عملی تجربہ نہ ہو یہ فرض ادا نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا یقیناً اس کوچے سے

نا آشنا تھے۔ان کے علم، مطالعہ اور فکر کی سطح اور تھی۔ اسی لیے وہ مدرسہ کے مولویوں کو اپنے سے زیادہ اس کا اہل سمجھتے تھے۔غامدی صاحب تو مولویوں کو کسی قابل نہیں سمجھتے. بات بے بات فتویٰ دینے کے لیے تیار رہتے ھیں. ان کا خیال ھے کہ مولویوں کے مقابلے کے لیے مولوی بننا پڑے گا ورنہ عوام پھر مولوی کے ھتھے چڑھ جائیں گے. ایک زمانہ میں تو غامدی صاحب نے عوامی رابطے کے لیے خانقاہ کا بھی دینی جواز ثابت کر دیا تھا اور ان کے شاگرد ڈاکٹر فاروق خان نے اپنی کتاب میں جو المورد سے شائع ھوئی خانقاہ اور مربی کی ضرورت پر پندرہ صفحات لکھے تھے اور لکھا تھا کہ فی الحال اس طرح کا کوئی آدمی ھمیں دستیاب نھیں لیکن خانقاہ بھت ضروری ھے جو خاص طور پر خدمت خلق اور لوگوں کے مسائل کے حل کے لیے ھو غامدی صاحب کی تقریروں میں اس کی تائید موجود ھے۔

فراہی صاحب مسئلہ بتانے سے احتراز غامدی صاحب ہر وقت تیار:

فراہیؒ صاحب کوئی دینی مسئلہ بھی نہیں بتاتے تھے۔عبداللہ خان نے مجھ سے بیان کیا۔

ایک بار کا ذکر ہے میں نے مولانا سے کوئی مسئلہ پوچھا۔مولانا نے کہا میں مفتی نہیں ہوں مجھ کو مسئلہ بتانے کا حق نہیں۔اس کے بعد سب لوگ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد جانے لگے۔ میں نے موقع دیکھ کر اسی بات کو دوسرے انداز سے پوچھا کہ مولانا اگر آپ کو یہ صورت حال پیش آئے تو آپ کیا کریں گے۔ مولانا نے بتا دیا کہ میں یہ کروں گا۔اس طرح مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

یہ نہیں معلوم کہ مسئلہ کیا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ روزہ نماز کا کوئی معمولی مسئلہ تھا جس سے ہر آدمی کو عملاً واسطہ پڑتا ہے۔لیکن اس کے باوجود مولانا نے مسئلے کی صورت میں جواب دینے سے اجتناب کیا۔معلوم ہوتا ہے مولانا جس طرح نماز پڑھانے سے بچتے تھے مسئلہ بتانے سے بھی کتراتے تھے اور اس کی وجہ احتیاط اور ذمہ داری کا احساس ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا علم ناکافی تھا اور وہ مسائل کا استنباط نہیں کر سکتے تھے۔[ذکر فراہی،ص ۱۷۸]یہ اس شخص کا حال تھا جو جدید قدیم علوم کا جامع تھا جس کے بارے میں غامدی صاحب کا کھنا ھے کہ ایسا آدمی تاریخ میں پیدا نھیں ھوا یہ شخص غامدی کے الفاظ میں ائمہ اربعہ سے بڑا بلکہ

صحابہ کرام کی صف کا آدمی تھا جو ان کے قافلے سے بچھڑ کر ھند میں وارد هوا تھا اس قدر علم کے باوجود وہ دینی مسئلے بتانے کے بجائے مولویوں سے رجوع کرنے کی هدایت کرتے تھے اور غامدی صاحب مولویوں کے دشمن هیں انھیں بر ا بھلا کھتے هیں اور فراهی صاحب کی روح کو کچو کے لگاتے هیں.

فراہی صاحب اسراف سے اجتناب اور معاملات میں صفائی: غامدی صاحب اسراف کے عادی

مولانا امین اصلاحی نے مجھ سے بیان کیا۔

کفایت سادگی وصفائی ان کی زندگی کے نمایاں پہلو تھے۔ لین دین کے معاملات میں حد درجہ محتاط تھے۔ کسی سے کچھ لینے کی ضرورت تو شاید ہی زندگی میں کبھی ان کو پیش آئی ہو۔ دینے کے معاملے میں بڑے فیاض تھے اور آمدنی کا بیشتر حصہ اسی طرح کے کاموں میں صرف کر ڈالتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کی تعلیمی سرگرمیوں اور دوسرے رفاہی کاموں میں ان کے دست راست مولانا ہی تھے۔

کوئی غیر ضروری چیز جس کا تعلق اسراف سے ہواس کا کوئی شائبہ ان کی زندگی میں نہیں تھا جو چیزیں ہوتی تھیں نہایت سلیقے اور قرینے کی ہوتی تھیں۔ زندگی میں بلا کسی تصنع اور اہتمام کے بڑی صفائی تھی۔ اس کے برعکس غامدی صاحب نے حال هی میں ڈیفنس سوسائٹی میں نئی رهائش گاہ اختیار کی هے جس کی مالیت پانچ کروڑ سے زیادہ هے. نئی پجیرو، بلٹ پروف جیپ اور حفاظتی دستہ یہ چونچلے فراهی مکتب فکر میں نہ تھے. لوگوں نے مجھے بتایا هے کہ غامدی صاحب اسٹارٹکسٹائل والوں سے هزاروں روپے ماهانہ تنخواہ لیتے هیں فراهی صاحب نے مدرسے کو دیا کچھ نہ لیا، سادہ زندگی بسر کی غامدی صاحب کی زندگی تو بڑی شاهانہ هے۔ مولانا اصلاحی کی شہادت ہے کہ رئیس ہونے اور بھاری تنخواہ پانے کے باوجود زندگی نہایت سادہ تھی۔ مکان میں معمولی فرنیچر، کپڑے نہایت سادہ پہنتے، کھانے میں کسی تکلف کے عادی نہ تھے۔ [ذکر فراہی، ص ۸۹۴] غامدی صاحب کا اس طرز عمل سے کیا تعلق؟ ان کے ہر حلقے کا ہر آدمی مغز امجد، ساجد حمید، سلیم شہزاد، طالب محسن، خالد ظہیر، سمیع مفتی ایسے ٹھاٹھ باٹ اور شان وشوکت وتصنع سے رہتے ہیں کہ تصور نہیں کیا جا سکتا یہ دنیا دار لوگ سادگی کا ان سے کوئی تعلق نہیں ان کا فراہی اور اصلاحی سے کیا تعلق معز امجد کا حال تو یہ ہے کہ درس

حدیث وقرآن دیتے ہوئے سگریٹ پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ممانعت کہاں ہے غامدی صاحب کی طرح ہر بات میں کہتے ہیں کہ یہ فرض ہے نہ سنت میں نے ایک بار غامدی صاحب سے پوچھا کہ غامدی صاحب اپنے باپ کے جنازے میں شرکت اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کیا فرض ہے یا سنت ہے تو چپ ہو گئے میں نے پوچھا کیا وجہ ہے کہ ہر آدمی اور خود آپ بھی ایسے موقع پر لازماً شرکت کرتے ہیں آخر کیا ضرورت ہے جنازہ فرض کفایہ ہے گھر میں بیٹھے رہو خاندان کے لوگ دفن کر دیں گے بیٹی کی شادی میں شرکت نہ کرو دوسرے لوگ شرکت کرلیں گے لیکن کوئی ایسا بیٹا اور باپ تاریخ نے پیدا نہیں کیا جو اپنے باپ کے جنازے میں اور بیٹی کے نکاح میں شرکت نہ کرے اس بنیاد پر کہ نہ یہ فرض ہے نہ سنت۔ تو ہم ان امور کو فرض سے بڑھ کر کیوں انجام دیتے ہیں غامدی صاحب چپ ہو گئے۔

رہن سہن میں سادگی: غامدی صاحب اور شاگرد عیش وعشرت کے عادی

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

مولانا ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھنے اور بیش قرار تنخواہ پانے کے باوجود زندگی نہایت سادہ اور طالب علمانہ بسر کرتے تھے۔ مکان میں معمولی فرنیچر ہوتا، کپڑے نہایت سادہ پہنتے، کھانے میں بھی کسی تکلف کے عادی نہیں تھے۔ تنخواہ کا بیشتر حصہ یا تو کتابوں کی خرید اور ان کی پر تکلف جلدوں پر خرچ ہوتا تھا یا پھر مستحقین خصوصاً غریب اہل علم اور نادار شرفا کی امداد اور اس دوسری مد کا خرچ ان کے ہاں کافی وسیع ہوتا۔ غامدی صاحب کا ان امور سے کیا تعلق؟ غامدی صاحب غریب گھرانے کے فرد تھے۔ رئیس نہ تھے لیکن ان کے ٹھاٹ باٹ رئیسانہ ہیں ۱۹۸۸ء میں بھی وہ ایئر کنڈیشنڈ استعمال کرتے تھے۔ اسے آلہ تکیف اپنی تحریر میں لکھتے تھے جب کہ فراہی صاحب خاندانی رئیس لیکن سادگی کے پیکر تھے۔

فراہی صاحب کا معیار زندگی اور غامدی کا معیار زندگی:

مولانا کی زندگی کے آخری پانچ چھ سال میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔ اس دور میں انھوں نے اپنی زندگی کا معیار تقریباً وہی بنالیا تھا جو مدرسۃ الاصلاح [سرائے میر، اعظم گڑھ] کے غریب اساتذہ اور طلبہ کا تھا۔ ہمارے ہی ساتھ بیٹھ کر جو دال دلیا میسر آتا کھا لیتے، ہماری ہی طرح سادہ اور غریبانہ کپڑے پہنتے، ہمارے ہی ساتھ ٹاٹ پر بیٹھتے۔ ان کی باعظمت پیشانی اور ان کے نورانی چہرہ کے سوا اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے ایک اجنبی ہمارے درمیان ان کی بڑائی کا اندازہ کرسکتا اور یہ تو ان کو

دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ علوم مشرقیہ اور علوم مغربیہ کا یہی وہ مجمع البحرین ہے جو مولانا شبلی نعمانی جیسے محقق کا مرجع استفادہ رہ چکا ہے۔ [ذکر فراہی، ۹۲۵]

مولانا فراہی کے ساتھ اصلاحی و غامدی مکتب فکر کا سلوک

ذکر فراہی میں شرف الدین اصلاحی کے انکشافات

شرف الدین اصلاحی

حمید الدین فراہی کی پہلی مستند سوانح ذکر فراہی کے نام سے ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے تحریر کی۔ اس سوانح کا جو حشر ہندوستان میں دائرہ حمیدیہ، حلقہ فراہی اور پاکستان میں حلقہ اصلاحی و غامدی نے مشترکہ طور پر کیا اس کی کہانی شرف الدین اصلاحی کے قلم سے ''تذکرہ فراہی'' کے ورق ورق پر درج ہے۔ یہ کتاب غامدی صاحب کے مکتبہ فکر کے ادارے ''دارالتذکیر'' نے شائع کی ہے۔ اصلاحی صاحب اور غامدی صاحب فراہی صاحب کو اپنے مکتب فکر کا امام اور ائمہ سابقین کے مقابلے میں سب سے افضل و برتر مانتے ہیں لیکن اپنے اس محسن کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اس کا مختصر قصہ پڑھیے۔ اس قصے سے اصلاحی و غامدی مکتب فکر کی اخلاقیات اور احسان فراموشی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے اقتباسات ملاحظہ فرمایے۔

[۱] مولانا امین احسن اصلاحی کے بارے میں ان کے استاد بھائی اختر احسن اصلاحی نے کہا تھا کہ کوئی نہیں چاہتا کہ دنیا مولانا فراہی کو بھی جانے۔ یہی بات مجھے رہ رہ کر یہاں آتی ہے کوئی نہیں چاہتا کہ فراہی پروجیکٹ اتمام کو پہنچے۔ [ذکر فراہی، ص ۲۷، دارالتذکیر لاہور]

[۲] ''ذکر فراہی'' دائرہ حمید بھوپال کو اشاعت کے لیے دی گئی تو ایک تہائی مواد مصنف کی اجازت کے بغیر خارج کر دیا گیا۔ کتابت املاء انشاء متن حروف بنی صوری و معنوی لحاظ سے کمتر لگتا ہے کہ کسی نے دیکھا ہی نہیں یا دیکھنے والے انتہائی نااہل اور غیر ذمہ دار لوگ تھے۔ سب کچھ دانستہ سازشی انداز

میں کیا گیا اور پردہ ڈالنے کے لیے غلط بیانی اور ہیرا پھیری سے کام لیا گیا ورنہ پیش لفظ میں تدلیس ابلیس کا پرتو نظر نہ آیا۔[ذکر فراہی،ص۲۶]

[۳] دائرہ حمیدیہ نے ذکر فراہی کا ایڈیشن شائع کیا تو مصنف کی اجازت کے بغیر اتنے تصرفات کیے گئے کہ کتاب مسخ ہو کر رہ گئی۔جہل مرکب میں مبتلا کسی نیم خواندہ ملائے مکتب نے زبان و بیان میں اصلاح و تصحیح کی بھی کوشش کی ہے۔مولوی سعید ندوی کا نام تلامذہ میں شامل کرنے پر اعتراض کیا گیا جب کہ وہ فراہی کے شاگرد نہ تھے۔نجم الدین اصلاحی کا نام باب تلامذہ سے خارج کر دیا گیا۔مولانا مودودی کی ذیلی سرخی تبدیل کر کے کچھ کی کچھ کر دی گئی جس میں لفظی و معنوی تعریف کا ارتکاب کر کے متن میں بھی ردوبدل کر دیا گیا۔[ذکر فراہی،ص۲۵]

[۴] فراہی کی سوانح کے سلسلے میں امین احسن اصلاحی پورے برصغیر میں واحد فرد تھے لیکن بوجوہ میں ان سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکا ان کے قائم کیے ہوئے حلقے اور ادارے ہی کسی کام نہ آئے اور نہ ان کے پڑھائے ہوئے شاگردوں میں سے پراجیکٹ کا کچھ بھلا ہوا اور آخر میں تو استاد [امین احسن اصلاحی ساحل] شاگرد [خالد مسعود، جاوید غامدی وغیرہ وغیرہ ساحل] سب نے آنکھیں پھیر لیں۔سب اجنبی ہو گئے، پراجیکٹ پر جب کڑا وقت آیا تو سب کے سب زیر زمین روپوش ہو گئے کہ میں کہیں کوئی سوال نہ کر بیٹھوں۔پروجیکٹ تفویض ہوا تو ایک ڈھنڈورچی کے دفالی نے کہا۔مولانا اصلاحی کے ہاں سے ہر چیز بنی بنائی مل جائے گی لیکن مولانا اصلاحی یا ان کے کسی حلقہ بگوش کے ہاں سے فراہی کی مطبوعہ کوئی کتاب بھی نہ ملی۔[ذکر فراہی،ص۲۰]

[۵] مولانا فراہی کی زندگی میں ان کے پیچھے چور لگے مرنے کے بعد ان کی باقیات کے پیچھے بھی چور لگے رہے، فراہی پروجیکٹ شروع ہی سے چوروں اور چوریوں کا ہدف بنا رہا۔[ذکر فراہی،ص۱۱]

[۶] مولانا فراہی کی باقیات، ان کے افکار، ان کے خیالات، ان کی تحقیقات کس کس نے چوری کی اسکی تفصیلات ذکر فراہی کے مرتب نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں بیان کی ہے۔اس تفصیل کو آپ غامدی اصلاحی کے سرقوں پر مشتمل مضمون میں ملاحظہ فرمایئے۔شرف الدین اصلاحی کے مطابق تدبر قرآن کے تمام اہم حصے حمید الدین فراہی کے ان حواشی پر مشتمل ہیں جو مولانا فراہی نے قرآن کے دو نسخوں پر لکھے تھے۔یہ حواشی چھ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔دائرہ حمیدیہ نے یہ نسخے اصلاحی صاحب کو عاریتاً

دیے تھے۔ تدبر شائع ہونے کے بعد جب یہ نسخے طلب کیے گئے تو اصلاحی صاحب نے یہ نسخے دینے سے انکار کر دیا۔ یہ نسخے ایک صندوق میں بند تھے جو مولانا اصلاحی کی چارپائی کے نیچے رہتا تھا۔ یہ بدتمیزی، بدنصیبی اور گستاخی کی انتہا ہے کہ قرآن کریم کے نسخے پلنگ کے نیچے رکھے جائیں۔ یہ گستاخی، بے ادبی تمام جدیدیت پسندوں کا خاص وصف ہے۔ یہی نہیں مولانا فراہی کے بعض مسودات غائب کر دیے گئے اور بعد میں خالد مسعود کے نام سے ان کے ترجمے شائع کیے گئے۔ مولانا فراہی کی ''اسباق النحو'' جو سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب ہے اس کا سرقہ کر کے خالد مسعود نے اپنے نام سے شائع کر دیا اور اس سرقے کی تصدیق فرماتے ہوئے امین احسن اصلاحی نے اس پر دیباچہ بھی لکھا۔ اس کتاب سے مولانا فراہی کا لکھا ہوا دیباچہ تک نکال دیا گیا۔ فراہی صاحب نے قرآن وسنت کے جو اصول متعین کیے تھے اصلاحی صاحب اور غامدی نے ان اصولوں کو تسلیم نہ کیا۔ فراہی صاحب ٹوپی، داڑھی، درمیان سے مانگ، تہد۔ قربانی کو سنت قرار دیتے ہیں لیکن غامدی صاحب نے ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر حملے کے بعد یہ سنتیں بدل ڈالیں۔ فراہی صاحب نے تفسیر کا یہ اصول بیان کیا کہ قرآن کی ایک آیت کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں لیکن غامدی صاحب صرف پردہ سے متعلق قرآنی آیات کے ۲۰ سال میں ۲۵ مختلف مفاہیم متعین کر چکے ہیں۔

الاصلاح چار سال جاری رہ کر ۱۹۳۹ء کے آخر میں بند ہو گیا۔ امین احسن اصلاحی کے قلم سے مولانا فراہی کے مطبوعہ اجزائے تفسیر (عربی) کے اردو ترجموں کا سلسلہ اسی رسالے میں شروع کیا گیا۔ مصلحتاً ان ترجموں میں مولانا اصلاحی نے کچھ تصرفات بھی کیے۔ کہیں کہیں عبارت حذف کر دی گئی جس پر نکتہ چینوں نے گرفت کی۔ غالباً اس کے بعد ہی مولانا اصلاحی نے مجموعہ تفاسیر فراہی کے دیباچہ میں اس کے ذکر یا وضاحت کی ضرورت محسوس کی۔ لکھتے ہیں:

''میں نے بھی ان کے ترجمہ میں دیانت داری کے خیال سے کچھ زیادہ تصرف نہیں کیا ہے، صرف مقدمہ اور تفسیر سورہ فاتحہ سے بعض ایسے حصے ترجمہ میں حذف کر دیے ہیں جو بالکل ہی ناتمام یاد داشتوں کی شکل میں تھے'' الخ'' واقعی دیانت داری کا تقاضا یہی ہے۔ [ذکر فراہی، ص ۵۷۴]

بدرالدین اصلاحی نے مجھے بتایا کہ امین احسن اصلاحی کو خط لکھا گیا کہ فراہی کے مسودات کی اشاعت کی فکر کرنی چاہیے انہوں نے جواب میں یہ تجویز ارسال کی کہ مولانا فراہی کے مسودات کی اشاعت

کا کوئی فائدہ نہ ہوگا ان کو سمجھے گا کون۔ بہتر ہوگا کہ ان کے افکار کو سامنے رکھ کر اردو میں نئے سرے سے ایک تفسیر لکھ دی جائے۔ان کا خط پڑھ کر اختر احسن نے آہ سرد بھری اور حسرت و یاس کے عالم میں کہا کہ کوئی نہیں چاہتا کہ دنیا فراہی کو بھی جانے۔ میں نے اس خط کے بارے میں بدرالدین صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ محفوظ نہیں رہا[ص ۵۷۶ ذکر فراہی]۔

اگرچہ میں اپنے فکر کو حضرت الاساتذ علیہ الرحمۃ کے فکر کے ساتھ ملانا بے ادبی خیال کرتا ہوں، لیکن چونکہ واقعہ یہی ہے کہ میں نے عمر بھر استاذ کے سُر میں اپنا سُر ملانے کی کوشش کی اور میرا فکر ان کے فکر کے قدرتی نتیجہ ہی کے طور پر ظہور میں آیا ہے۔ اس وجہ سے یہ جوڑ ملانے کی جسارت بھی کر رہا ہوں، اگر یہ بے ادبی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے۔[ذکر فراہی، ص ۵۷۹] بے ادبی کی انتہا دیکھئے کہ قرآن کے علم کو سُر سے سُر ملانا کہا جا رہا ہے۔

''تدبر قرآن'' کو فراہی مکتب فکر کی نمائندہ تفسیر کہا جاتا ہے۔ تدبر قرآن لکھنے کے لیے امین احسن اصلاحی نے فراہی کی عربی تفسیر نظام القرآن کے مطبوعہ اجزا کے علاوہ تمام غیر مطبوعہ مسودات کی اصل کاپیاں دائرہ حمیدیہ (انڈیا) سے منگوالیں۔ قرآن مجید کے وہ نسخے منگوالیے جو مولانا فراہی کے زیر مطالعہ رہے اور جن پر ان کے حواشی اور نوٹس ہیں۔ ان حواشی کی کیفیت یہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کو الگ سے نقل کر رکھا ہے۔ اس کے مطابق وہ تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان تمام چیزوں کو اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر میں استعمال کیا۔ یہ تمام چیزیں دائرہ کی تحویل میں تھیں۔ اور دائرہ کی ملکیت تھیں۔ دائرہ کے قیام کا اولین مقصد ان غیر مطبوعہ باقیات کی حفاظت اور طباعت و اشاعت تھا۔ اس کام میں کوئی چاشنی نہ تھی۔ یہ ایک کڑوا گھونٹ تھا۔ اصلاحی صاحب کا کام مکمل ہو گیا تو یہ مسودات واپس گئے۔ مگر حواشی والے دونوں قرآن واپس کرنے سے امین احسن اصلاحی نے انکار کر دیا۔ واپسی کی کاروائی چونکہ میرے ذریعہ ہوئے اس لیے مجھے ان باتوں کا براہ راست علم ہے۔ فراہی کے ہاتھ کے عربی مسودات میں سے بھی کچھ چیزیں واپس نہیں گئیں۔ قرآن کے نسخے تو اصلاحی صاحب کے پاس ہیں مگر مسودات کے گم شدہ حصوں کا کچھ پتا نہیں چلا۔ گم یا کم ہونے کا پتا اس لیے چلا کہ مولانا بدرالدین نے اپنے ہاتھ سے ان کی نقلیں تیار کر کے رکھ لی تھیں۔ بدرالدین اصلاحی کا بیان ہے کہ گم شدہ اوراق کے ترجمے مولانا اصلاحی کے شاگرد خاص خالد مسعود کے قلم سے شائع ہوتے رہے۔ یہ شاگرد خاص مولانا اصلاحی کی سرپرستی میں شائع

ہونے والے رسالہ تدبر کے ایڈیٹر ہیں۔ یہی خالد مسعود ہیں جنہوں نے مولانا فراہی کی سب سے کثیر الاشاعت کتاب اسباق النحو اپنے نام سے چھاپ لی۔ کتاب کا نام وہی ہے۔ لیکن اس کے مصنف خالد مسعود ہیں۔ جواز یہ پیش کیا گیا کہ کتاب میں جو کمی تھی وہ خالد مسعود صاحب نے پوری کر دی ہے۔[ذکر فراہی، ص ۵۸۰]

واپس آ کر میں نے اس کا ذکر اصلاحی صاحب سے کیا اور ان سے پوچھا کہ آپ نے کچھ سوچا ہے۔ انھوں نے خالد مسعود کا نام لیا۔ گویا وہ نامزد خلیفہ ہیں۔ لیکن چونکہ مولانا ابھی زندہ ہیں اس لئے بکس ابھی تک انہی کے کمرے میں ہے۔ مولانا کی صحت جب زیادہ بگڑ گئی تو مجھے قرآن مجید کے ان دو نسخوں کا خیال آیا۔ میں نے خالد مسعود سے پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر نعمان صاحب سے دریافت کیا تو یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ نسخے محفوظ ہیں اور وہ بکس مولانا اصلاحی کے کمرے میں ان کی چارپائی کے نیچے ہے۔[ذکر فراہی، ص ۵۸۱] قرآن اور استاد کا ادب ملاحظ کیجئے۔

مولانا بدرالدین نے مجھ سے بیان کیا کہ یہ ترجمہ چند سورتوں کا ہے اور اس میں جگہ جگہ بیاض چھوٹی ہوئی ہے۔ سورۂ والنازعات غرقاً کے ترجمے میں قسموں کا حصہ مولانا نے نمبر لگا کر خالی چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ اصل مسودہ میں اسی طرح چھوٹا ہوا ہے۔ لیکن کسی نے بعد میں اسے پر کر دیا۔ کہاں سے کیا ہے یہ معلوم نہیں۔ کسی کے لئے بھی یہ بات مناسب نہیں کہ بغیر نوٹ اور حاشیہ کے مولانا کے کسی کام میں اس قسم کا تصرف یا عمل پیوند کاری کرے۔ مولوی بدرالدین صاحب نے بتایا کہ یہ کام دراصل عباد صاحب مرحوم نے کیا کہ وہی مسودات کی واپسی کا مطالبہ لے کر ان کے پاس آئے تھے اور وہی ترجمہ نقل کر کے لے گئے تھے۔ جسے بعد میں اپنے لڑکے کے نام سے چھپوایا۔ ترجمہ قرآن کے مطبوعہ نسخے میں دو جگہ مرتب کا یہ حاشیہ بھی لائق توجہ ہے کہ یہاں جگہ خالی تھی اور اسے مولانا امین اصلاحی کے ترجمہ سے پر کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کی ملاوٹ علمی اعتبار سے غلط روش ہے۔ علمی دنیا میں اسی طرح کے کام کے طریقے مقرر ہیں۔ اگر یہ روش چل نکلی تو فراہی کے سودے بازیچہ اطفال بن جائیں گے۔[ذکر فراہی، ص ۷۰۷]

مولانا اصلاحی کا تملق تکبر اور خود پسندی:

''مولانا فراہی ایک سر مخفی تھے، میں نے انہیں آشکارا کیا''۔

بین السطور معانی تک رسائی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ واقف حال اور محرم اسرار

ہی اس جملے کی پہلوداری کو سمجھ سکتے ہیں۔اس کی جگہ اگر وہ یہ جملہ کہتے تو زیادہ حقیقت کے قریب اور حسب حال ہوتا۔میں ایک بھٹکا ہوا راہی تھا فراہی نے مجھے راستے پر لگایا۔

ایک ملاقات میں کہا۔

میں نے ایک دھیلا خرچ کیے بغیر وہ کام کر دیا جس کے لیے ڈاکٹر حفیظ اللہ نے پچاس ہزار کا عطیہ دیا تھا۔اب انہیں مجھ سے یہ شکایت نہیں ہوسکتی کہ میں نے کچھ نہ کیا۔اور روز حشر مجھے ان سے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔جنہوں نے تفسیر تدبر قرآن پڑھی ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی محنت استاد کے کھاتے میں ڈال دی ہے۔[تذکرہ فراہی، ص۵۸۲]

مشن جس کے لیے فراہی نے سید سلیمان ندوی کے بقول امین احسن کو تیار کیا تھا اور جس کی حقانیت اور برتری کے وہ دل سے قائل تھے۔اس مشن کے لیے اس زمانے میں فراہی کے ایک عقیدت مند نے پچاس ہزار کی خطیر رقم کا عطیہ دیا تھا۔اور وہ رقم اصلاحی صاحب کے نام ان کے ذاتی اکاونٹ میں جمع کر دی گئی تھی۔اس وقت کے پچاس ہزار کی مالیت آج کے پچاس لاکھ کے برابر ہے۔وہ رقم ہمیشہ کے لیے ڈوب گئی۔ درد رکھنے والوں نے ہزار جتن کیے کہ مولانا کسی طرح ایک بار آ جائیں رقم نکلوانے کے لیے فقط ایک دستخط کرنا تھا۔وہ رقم ان کی بے اعتنائی کی وجہ سے ضائع گئی۔مذکورہ بالا پچاس ہزار سے متعلق دستاویز کی نقل فوٹو اسٹیٹ کاپی اور ضروری معلومات موجود ہیں۔ یہ بات ......خلجان کا باعث بنتی ہے جب آدمی دیکھتا ہے کہ پچاس ہزار کی رقم سے کوئی کام نہ کیا گیا اور اسے یوں ہی ضائع کیا گیا۔فراہی کے دو ارشد تلامذہ میں سے امین احسن اصلاحی کو بعض ایسی خوبیوں سے بہرہ وافر ملا تھا جو اختر احسن میں نہیں تھیں۔ان کے فراہی کے مدرسہ اور دائرہ کو چھوڑنے سے جو خلا پیدا ہوا وہ کسی طور پر نہ ہوسکا۔[ذکر فراہی، ص۵۷۵]

درمیان میں مولانا فراہی کے اخلاف کو خیال آیا اور انہوں نے دائرہ حمیدیہ کے ناظم بدرالدین اصلاحی سے ترجمے کی نقل لے کر اپنی طرف سے شائع کیا چھوٹی تقطیع پر ۱۲۰ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔مرتب کی حیثیت سے اس پر ''ابن الحمید الفراہی'' کا نام ہے۔میں نے قیاساً ابن الحمید کو محمد عباد صاحب پر محمول کیا۔جو مولانا فراہی کے چھوٹے بیٹے ہیں۔دارالمصنّفین کے ناظم ضیاءالدین اصلاحی نے بتایا کہ اس کا مصداق مولانا فراہی کے ایک پوتے حمداللہ ہیں۔طابع وناشر کی حیثیت سے

سرورق پر دائرہ حمیدیہ پھر یہا اعظم گڑھ اور مکتبہ الحسنات رام پور یو پی کے نام درج کیئے گئے ہیں۔ تحقیق پر بعض مناقشات کا علم ہوا جو افسوسناک اور تشویش انگیز ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء میں حذف و اضافہ کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا۔ مرتب کی حیثیت سے اس میں سرے سے کسی کا نام درج نہیں ہے۔ [ذکر فراہی، ص ۷۰۶]

جہاں قرآن خاموش ہے وہاں سنت مرجع و ماخذ ہے: غامدی
میں حجیت حدیث اور وحی غیر متلو کا قائل ہوں

ماخذات دین قرآن، سنت ثابتہ اور حدیث

جناب جاوید غامدی ماخذ دین کے بارے میں فرماتے ہیں دین تین صورتوں میں ملا ہے [۱] قرآن [۲] سنت ثابتہ [۳] حدیث۔ سنت ثابتہ اور قرآن میں ثبوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں وہ جس طرح تواتر سے ملا ہے اسی طرح سنت عملی تواتر سے ثابت ہے چنانچہ اس بارے میں کسی بحث و نزاع کی گنجائش نہیں حدیث اگر قرآن، سنت، ثابتہ فطرت اور عقل کے مطابق ہو تو اس کی حجیت بھی مسلم ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ [غامدی ص ۱۶ اشراق جنوری ۱۹۹۴ء]

ماخذ دین کے بارے میں کم و بیش یہی موقف غامدی صاحب نے اشراق فروری ۱۹۹۴ء کے ص ۴۳ پر ام عبدالرب کے نام ایک خط میں اختیار کیا ہے۔ خط کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے کہ ''ماخذ دین کے بارے میں یہ میرا نقطۂ نظر ہے اس کے بعد میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے متعلق کسی اضطراب کے لئے کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔''

اشراق جون ۱۹۹۱ء میں ص ۲۱ پر غامدی صاحب کا ایک خط مورخہ ۲۱/ اپریل ۱۹۸۹ء بنام استاد پروفیسر شیر محمد کے نام ہے [شیر محمد اختر صاحب رکن جماعت اسلامی تنظیم اساتذہ کے رہنما اور غامدی صاحب کے استاد رہ چکے تھے، ساحل] اس میں واضح طور پر غامدی صاحب فرماتے ہیں۔

داڑھی، ختنہ اور بے شمار دوسری چیزیں سنت ہیں: جاوید غامدی

سنت کو مستقل بالذات شارع مان کر دین میں شامل سمجھتا ہوں

اس طرح کے معاملات میں سنت کا انکار ضلالت ہے

حدیث کے بارے میں میرا نقطہ نظر غالباً پوری طرح واضح نہیں ہوسکا۔ رسالت مآب کو میں صرف قرآن مجید کا شارح ہی نہیں مستقل بالذات شارع بھی مانتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے مضمون میں جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے بصراحت لکھا ہے۔ ''وہ امور جن میں قرآن مجید بالکل خاموش ہے اس طرح کے معاملات میں سنت بجائے خود مرجع و ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے رجم کا معاملہ چونکہ دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے اس وجہ سے میں نے اس پر بحث کی اور عام رائے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے ورنہ داڑھی ختنہ اور اس طرح کی بے شمار دوسری چیزوں میں سنت کو مستقل بالذات شارع مان کر ہی دین میں شامل قرار دیتا ہوں۔ وحی غیر متلو کے وجود سے بھی مجھے انکار نہیں ہے قرآن جہاں خاموش ہے اور ہمیں کوئی حکم وہاں صرف سنت ہی کے ذریعے ملا ہے اس طرح کے معاملات میں سنت کو مستقل بالذات شارع مانتا ہوں اور اس کی اس حیثیت کے انکار کو بالکل ضلالت سمجھتا ہوں۔ [اشراق جون ۱۹۹۱ء، ص ۲۱]

سنت ثابتہ، حدیث، حجیت حدیث، وحی متلو پر غامدی صاحب کا یہ موقف واضح کرتا ہے کہ ۱۹۹۵ء تک وہ مسلک جمہور سے قریب تر تھے لیکن رفتہ رفتہ انحراف کا عمل شروع ہوا۔ اس عمل کی بنیاد کیا تھی؟ انحراف کی دلیل کیا تھی؟ سنتوں کی نئی تعریف کے تعین کے اصول کیا تھے؟ غامدی صاحب کے اس ارتقاء کا ماخذ مصدر، منبع کیا تھا............ دین کہاں سے اخذ ہوگا، کیسے اخذ ہوگا، اخذ کرنے کے اصول کیا ہوں گے؟ کیا دین اخذ کرنے کے اصول ہر شخص وضع کرسکتا ہے اگر کرسکتا ہے تو اس کی دلیل کیا ہے اس دلیل کی تائید و توثیق کس اصول سے ہوگی ورنہ یہ بھی کشف کی طرح کا معاملہ ہوگا کہ کسی کو کشف ہوگیا ہے اور دلیل یہ ہے کہ مجھے ہوا ہے ان اصولوں کے تعین کے بغیر دین اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ سائنس اور فلسفہ بھی ایمانیات و الٰہیات پر ایمان لاکر جنھیں اصطلاح میں مفروضات کہا جاتا ہے۔ اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ لہٰذا سائنس، فلسفہ اور مذہب کے کچھ مسلمات اور ایمانیات ہیں۔ مثلاً خدا موجود ہے یہ ایمانیات کا حصہ ہے اس کے لیے کوئی قاطع دلیل نہیں دی جاسکتی۔ جتنے دلائل خدا کے وجود کے حق میں دیے جاسکتے ہیں اتنے ہی دلائل اس کے رد میں لائے جاسکتے ہیں مثلاً غامدی صاحب آج کل وجود خدا پر جو احمقانہ دلائل ٹی وی پر دے رہے ہیں یہ سب اٹھارہویں صدی کے فلسفے میں اٹھ چکے اور رد ہوچکے ہیں۔ ان

احمقانہ دلائل سے فلسفے کا مبتدی بخوبی واقف ہے۔ Designed Argument یعنی تخلیق کے وجود سے خالق کا وجود ثابت کرنا غامدی صاحب سے دوسوسال پہلے ولیم پیلے یہ کام کر چکا ہے اسے Telogolgical argument بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دلیل اسکاٹش فلسفے نے بھی استعمال کی ہے مگر فلسفے کی دنیا میں اسے Week analogy قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ غامدی صاحب جان ہک کی فلسفے کی ابتدائی کتاب Introduction to Philosophy of Religion کا مطالعہ کر لیتے تو وجود خدا کے لئے اٹھارہویں صدی کی مسترد شدہ دلیلیں پیش نہ کرتے Designed Argument کو کانٹ نے اپنی کتاب Critique of Pure Reason میں علمی بنیادوں پر مسترد کر دیا ہے۔ کانٹ خدا کا قائل ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ ہم اس کے وجود کو دلائل سے اور حواس سے ثابت نہیں کر سکتے۔ کانٹ نے اپنی اسی کتاب کے باب Rational Theology میں غامدی صاحب کی احمقانہ دلیل کو دلائل سے مسترد کر دیا ہے۔

عام طور پر ٹی وی کے ناظرین اور بڑے بڑے مفکر اور عالم بھی فلسفے کے مبتدیانہ مباحث سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا غامدی صاحب پاکستانی لوگوں کی جہالت اور جاہلیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وجود خداوندی پر اپنے جاہلی علم وفضل کے موتی ان کے سامنے بکھیر رہے ہیں اگر کوئی فلسفی ان کے سامنے موجود ہوتا تو صرف دس منٹ میں غامدی صاحب کے تمام احمقانہ دلائل فلسفیانہ اور منطقی بنیادوں پر مسترد کر دیتا اور غامدی صاحب کوئی جواب بھی نہ دے سکتے اصل سوال تو یہ ہے کہ خدا کو ماننے نہ ماننے کا مسئلہ کہاں پیدا ہوا ہے آج بھی دنیا کے ۹۸ فی صد لوگ خدا کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں خدا کو ماننا نہ ماننا مسئلہ ہی نہیں ہے امریکہ یورپ میں لوگ خدا کو مانتے ہیں پاکستان میں یہ مسئلہ کہاں سے پیدا ہو گیا ہنگٹنٹن نے اپنی کتاب "The Clash of Civilization" میں تمام اعداد و شمار دیے ہیں کہ دنیا میں کتنے لوگ خدا کو نہیں مانتے اصلاً غامدی صاحب اس سوال کی آڑ میں جدیدیت کو عام کرنے کے امریکی ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں یعنی وہ موضوعات جو معاشرے کا موضوع نہیں ہیں انہیں زبردستی اہم ترین موضوع بنا دیا جائے اس طرح کے سوالات کے ذریعے وہ ذہن تیار کیا جائے جو ہر مسلمہ فکر، مسلمہ قدر، مسلمہ نظریات، مسلمہ اصولوں، مسلمہ شخصیات کے بارے میں الٹے سیدھے سوالات شروع کر دے اور کسی ایسی ہستی کو باقی نہ رہنے دیا جائے جو ایمان کا حصہ ہو ہر ہستی سوال کی اقلیم میں لا کر ایک لاینحل سوال بنا کر اعتراضات کی بوچھار میں کھڑی کر دی جائے اور لوگوں کو بتایا جائے کہ اسے ترقی کہتے ہیں آزاد خیالی

روشن خیالی یہ ہے کہ ہر موضوع پر بلا دھڑک بے تکان اظہار خیال کرتے جاؤ سوال پوچھتے جاؤ ایک ہیجان، خلجان، انتشار، اضطراب میں مبتلا رہو تا کہ اصل معاملات سے توجہ ہٹ کر بے کار معاملات میں الجھا دی جائے اور آخر کار ہر فرد خود کہہ دے کہ بھئی مذہب سے جان چھڑاؤ یہ تو عقل میں نہیں آتا لہٰذا عقل کی حکمرانی قائم کر کے تمام مسلمات Authorities کا انکار کر دیا جائے اور عقل کو ہی اصل ماخذ اصل منبع اصل مرجع سمجھا جائے جدیدیت کی مختصر لفظوں میں تعریف یہی ہے کہ وہ عقل کے سوا ہر مسلمہ مقتدرہ Authority کا انکار کرتی ہے اور عقل کو ہی خیرِ کل Absolute Truth سمجھتی ہے علم عقل سے شروع ہوتا ہے عقل پر ختم ہوتا ہے وہ علم علم نہیں جو عقل کے بجائے کسی خارجی ذریعے External Authority سے آئے لہٰذا وحی پر ایمان رکھنے والے جدیدیت پسندوں کی نظر میں احمق جاہل ہیں بلکہ انسان [Human] کہلانے کے مستحق نہیں ہیں اسی فلسفے کے تحت براعظم امریکہ میں ۹ کروڑ سرخ ہندی باشندوں کو پچاس سال میں قتل کر دیا گیا اسی فلسفے کے تحت آج کل دنیا میں مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے۔ غامدی صاحب کے ردی فلسفے سے یعنی گھڑی کے وجود سے گھڑی کے خالق کا وجود تو ثابت ہو گیا لیکن یہ کیسے ثابت ہوا کہ خالق آج بھی زندہ ہے گھڑی ساز کبھی نہ کبھی مر جاتا ہے۔ تاج محل کا وجود ہے خالق کا وجود کہاں ہے؟ یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ جو خالق ہے وہ حساب کتاب بھی کرے گا وہ ہمہ وقت ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے اسے کل علم حاصل ہے تمام طاقتوں کا مرکز اس کی ذات ہے وہ سراسر خیر ہے وہ ایک زندہ و بیدار ہستی ہے اور کائنات اور ہمارے اعمال اس کی نگاہ میں ہیں کیا خالق کو یہ معلوم تھا یا ہے کہ اس نے کیا تخلیق کیا ہے اور یہ تخلیق آئندہ کیا کرے گی اگر خالق سراسر خیر ہے تو کائنات میں شر کا وجود کیوں ہے؟ اگر وہ عادل اور خیر مطلق ہے تو کائنات میں رقص ابلیس اور قتل و خون پر خاموش کیوں ہے یہ وہ سوالات ہیں جو ماضی میں اٹھے اور آئندہ بھی اٹھیں گے اور غامدی صاحب جیسے نادان طرف دارانِ خدا کے سرقہ شدہ فلسفے سے اٹھیں گے ظاہر ہے اسلامی منہاج میں رتو ان سوالوں کے جوابات مل سکتے ہیں لیکن غامدی صاحب کے بیگانہ منہاج میں ان سوالات کا جواب نہیں دیا جا سکتا یہی غامدی صاحب کے سرقہ شدہ طرز استدلال کی کم زوری ہے۔ جرمن سائنس داں نے Fatboy نیوکلیر بم بنایا وہ اس بم کا خالق تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ اس نے جو جوہری بم تخلیق کیا ہے یہ کیسی مخلوق ہے اسے معلوم نہ تھا کہ اس نے کیا بنایا ہے لہٰذا جب بم بن گیا اور اس کی تباہ کاری کا اندازہ ہوا تو اس نے کہا کہ ”آج کے بعد سے ہم

سب جو اس کام میں شریک تھے وہ سب کتے کے بچے ہیں' Cause' اور Effect سے خدا کو ثابت کرنا ممکن نہیں ہے سینٹ انزلم اور آگسٹائن وغیرہ نے غامدی صاحب سے زیادہ مضبوط دلیلیں وجود خداوندی کے لئے دی تھیں اگر غامدی صاحب ان دلیلوں کو پڑھ لیتے تو یقیناً اور جھکتے لیکن وہ یاد رکھیں کہ ان مضبوط دلیلوں کو بھی فلسفے کی دنیا میں اس سے زیادہ مضبوط دلائل سے رد کر دیا گیا جو وجود خداوندی کے لیے دیے گئے تھے اس سلسلے میں Ontological argument بھی کام نہیں آسکا کیونکہ

Limits of Rationality is a limit of human mind

ایک محدود ذہن لامحدود ہستی کو ثابت نہیں کر سکتا لیکن اس پر ایمان، یقین، اعتقاد رکھ سکتا ہے جہاں عقل و ذہن ساتھ چھوڑ دیں وہاں انسان کی بے بسی کا اعلان ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی بے کسی کا اعتراف کر کے سجدے میں چلا جاتا ہے یا عقل کے حوالی سے ایمان کی آغوش میں بے تابانہ گر جاتا ہے اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ عقل کا مقام دل ہے اور اگر گوشت کا یہ لوتھڑا قلب، فواد، درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے یہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے این سلم نے Ontological argument میں دلیل یہ دی تھی کہ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا Perfect being ہے تو اس سے خود بخود ثابت ہو گیا کہ اس کا وجود بھی لازماً ہوگا ورنہ وہ Perfect نہیں ہوسکتا اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میری جیب میں ایک ہزار روپے کا نوٹ ہے اس کی تعریف بیان کر دے، خصوصیات، صفات، تجلیات بیان کر دے تو کیا اس تعریف بیان کرنے سے جیب میں ایک ہزار روپے کا نوٹ آجائے گا کسی چیز پر ایمان یا اس کی تعریف اس کے وجود کی دلیل نہیں بن سکتی کانٹ کی نظر میں وجود Property نہیں ہے دین کی کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہوتی غامدی اور اصلاحی کی کمزور ترین دلیل ہے یہ کہنا چاہیے کہ دین کی کوئی بات حکم رسول کے خلاف نہیں ہوسکتی اس لئے کہ دین وہ ہے جو رسول اللہ نے ہمیں بتایا ہے خواہ وہ ہماری محدود عقل میں نہ آسکے اور سائنس کے بے شمار نظریے، اصول آج بھی عقل تو کیا تجربہ گاہ میں بھی ثابت نہیں کیے جاسکتے ان پر ایمان لایا جاتا ہے تین ہزار سال تک نیپچون سائنسدانوں کی نظر میں [Planet] سیارہ تھا۔ لیکن ۲۰۰۶ء میں سائنس دانوں نے اسے نظام شمسی سے خارج کر دیا تین ہزار سال تک تمام حساب کتاب اس کو شامل کر کے کیا جاتا رہا تین ہزار سال کے تمام حساب کتاب غلط ہو گئے لیکن کسی ایک سائنس دان نے یہ نہیں کہا کہ ہمارا ایمان سائنس اور فلکیات سے اٹھ گیا ہے تو پھر دین پر عدم

اعتماد اور ایمان اٹھنے کا سوال کیوں پیدا ہو رہا ہے اور پیدا ہو رہا ہے یا غامدی صاحب پیدا کر رہے ہیں؟

غامدیانہ دعوے

جاوید غامدی: تاریخ فکر اسلامی کے زعیم: زنیم یا ختار

جناب غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ دبستان شبلی کے آخری آدمی ہیں جو مشرقی و مغربی علوم کے جامع ہیں اور ان کا فکر مشرق و مغرب کے مابین ایک آخری پل ہے جس کے ذریعے دونوں تہذیبوں میں مصالحت، مفاہمت اور مکالمے کا امکان ہے۔ ان کے خیال میں مغرب کی سائنسی ترقی فکر اسلامی کی توسیع ہے اور مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کی ہی جلوہ گری ہے۔ مغرب نے مذہب انسانیت اور بنیادی حقوق کے تصورات دے کر پوری دنیا کو انسانیت کے مشترکہ کلمے پر جمع کر دیا ہے جو انبیاء کی دعوت کا منہاج تھا اور اسلامی انقلاب کی معراج و مقصود بھی ....لہٰذا اب مغربی تہذیب تاریخ کے اس موڑ پر آ گئی ہے جہاں تاریخ کا سفر اختتام پذیر ہو گیا ہے اور وہ تیزی سے اسلام کے قریب آ رہی ہے اور ممکن ہے کہ وہ اسلام میں ضم ہو جائے لیکن مغرب کے قبول اسلام کی راہ میں اصل رکاوٹ علماء دین، اسلامی تحریکیں، اسلامی جماعتیں اور امت مسلمہ کا وہ تصور دین ہے جو قرآن سنت اجماع و قیاس کے ماخذات کے ذریعے ظہور کرتا ہے لیکن یہ ظہور دین اسلام کا اصل چہرہ اصل رنگ اور اصل حقیقت نہیں ہے۔ روایتی اسلام جو ائمہ اربعہ کے اجماع اور مسلک جمہور کے ذریعے امت مسلمہ کی ترجمانی اور اس امت کے عقیدے کی نگہبانی کرتا ہے فی الاصل مغرب کی اسلام سے وحشت کا واحد سبب ہے لہٰذا اصل دین کا چہرہ اگر مغرب کو دکھا دیا جائے تو مغرب اسلام کی آغوش میں آ جائے گا۔

غامدی صاحب ان خیالات کو اپنے خوبصورت اسلوب، دل نشین پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے ان کی طلاقت لسانی کے قائل ہو جاتے ہیں لیکن جب ان کی خطابت اپنا گھونگھٹ الٹ کر حقیقت، تاریخ، فلسفہ، منطق، سائنس کی دنیا میں آتی ہے تو یہ محض جہالت اور جاہلیت خالصہ رہ جاتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ علمی مسائل کی صحت اور عدم صحت کا تعین عوام کی ذمہ داری نہیں ہے۔ عوام کالانعام ہوتے ہیں وہ نہ علم رکھتے ہیں نہ تحقیق کا ذوق نہ ان کی علمی سطح اس قابل ہوتی ہے کہ وہ غامدی صاحب جیسے متجددین، منکرین حدیث کے افکار کا ناقدانہ جائزہ لے سکیں۔ لہٰذا غامدی صاحب اپنی خطابت سے افکار اسلامی کا......جو تانا بانا بنتے ہیں وہ خوبصورت تو نظر آتا ہے لیکن یہ مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور ہے۔ ذیل میں ہم غامدی صاحب کے دعوؤں کا جائزہ لیں گے اور مغربی فکر و فلسفہ کی تاریخ

سے ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ غامدی صاحب مغرب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ انھیں مغربی فلسفے و تاریخ کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں ہے۔ انھوں نے انسانی حقوق کے منشور Human Right Dectraction کو اسلامی قرار دے کر اہل عالم کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے جب کہ مذہب انسانیت کا یہ دستور وحی الٰہی یا سنت محبوب الٰہی سے اخذ نہیں کیا گیا بلکہ فیڈرلسٹ پیپرز اور امریکی دستور سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کی مرتّبہ امریکی صدر روز ویلیٹ کی اہلیہ ایلینا روز ویلیٹ ہیں۔ امریکی ریاست اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد مذہب حقوق انسانی پر رکھی گئی ہے جو مغرب کے جدید فلسفے سے رہنمائی لیتا ہے یہ فلسفہ ڈیکارٹ سے شروع ہوا تھا۔ *I think therefore I am* تاریخ فلسفہ میں ڈیکارٹ پہلا فلسفی ہے جس نے اس جملے کے ذریعے وجود انسانی کے سوا ہر وجود کو ناقابل اعتبار ٹھہرا کر مابعد الطبیعیاتی سوالات کو فلسفے کی اقلیم سے خارج کرنے کا فریضہ انجام دیا جس کا حتمی نتیجہ بیسویں صدی میں سامنے آیا، جب پوسٹ ماڈرن ازم کے فلاسفہ نے پچیس سو سال تک فلسفہ میں زیر بحث آنے والے تین سوالات کو جن کا تعلق Metaphysics، Epistemology، Axiology[Values] سے تھا لایعنی قرار دے کر فلسفے کی تاریخ بدل ڈالی۔

وہ تین سوالات جو پچیس سو سال تک حقیقت کلی، حقیقت ازلی اور حقیقت ابدی کے تصور اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے نتیجے میں خیر و شر کے معیارات کے تعینات سے متعلق تھے۔ فلسفہ پس جدیدیت [Post modren Philosphy] نے ان سوالات کو لایعنی، مہمل، فضول، بے کار، بے تکے قرار دیا۔ سوالات یہ تھے:

[1] What is real [2] How do we know. [3] What is good, right, or beautiful.

ڈیکارٹ نے جس ریب، شک، تشکیک کی بنیادوں پر اپنے فلسفے کی عمارت تعمیر کی بالآخر یہ بنیادیں فلسفے کی قدیم بنیادوں کے انہدام کا سبب بن گئیں اور دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی تہذیب وجود پذیر ہوئی جس نے مابعد الطبیعیاتی سوالات کا انکار کیا۔ خدا کے وجود سے منحرف ہوئی۔ خیر و شر کے تمام پیمانوں کو لغو بے کار لایعنی قرار دے کر خواہش نفس کو الہٰ العالمین قرار دے دیا اور نفس انسانی کو خیر و شر کا ماخذ، حق و باطل کا پیمانہ، اندھیرے اور اجالے کا منہاج قرار دے کر الوہیت رب کے بجائے الوہیت

انسانی کا مذہب ایجاد کیا۔[Religion of human rights] جس نے بحر و بر کو فساد سے بھر دیا اور دنیا کو ایک ایسی ہولناک جنگ میں جھونک دیا جس میں تین سو سال کے اندر مغربی اقوام کے ہاتھوں ایک ارب پچھتر کروڑ لوگ مارے جا چکے ہیں۔اس سلسلے میں کیمبرج یونیورسٹی سے شائع ہونے والی مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of the Democracy اور ساحل کے جون، جولائی، اگست اور ستمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے ملاحظہ فرمایے۔ٹائن بی کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو دنیا میں اکیس تہذیبیں رہی ہیں لیکن ان اکیس تہذیبوں میں ایک بھی ایسی تہذیب نہ رہی جس میں مابعد الطبیعیاتی سوالات موجود نہ رہے ہوں جس میں خدا اور آخرت کے تصورات نہ پائے جاتے ہوں جہاں خیر و شر کے مستقل اور معین پیمانے نہ ہوں، جہاں حق و باطل تاریخ کے ہر موڑ پر تبدیل ہوتا ہو۔ان معنوں میں مغربی تہذیب جسے مار ماڈیوک پکتھال تہذیب نہیں، بہیمیت [savegry] کہتے ہیں اور اسے کتے بلیوں کی تہذیب قرار دیتے ہیں۔دنیا کی واحد تہذیب ہے جو گناہ کو خیر کل، حقیقت کلی، حقیقت ازلی وابدی سمجھتی ہے، وجود خدا کے ساتھ ساتھ وجود آخرت کا انکار کرتی ہے۔دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتی ہے اور اسی دنیا میں جنت تعمیر کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔مغرب کی یہ مادی جنت سائنس وٹیکنالوجی کی بیساکھیوں پر کھڑی ہے اور اس جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا حق صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے خادم بن کر شب و روز اس کی بیگار میں جت کر زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکیں اور پھر زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کر سکیں۔خدا کی جنت میں نہ محنت ہے نہ مشقت نہ بھوک، نہ پیاس، نہ خوف، نہ ماضی کا خدشہ، نہ مستقبل کا اندیشہ، نہ لغو، نہ لہو، نہ لعب وہاں ہر چیز بلا معاوضہ ملے گی لیکن مغرب کی سائنس وٹیکنالوجی کی مصنوعات پر مشتمل زمینی جنت پیسے کے بغیر نہیں مل سکتی لہٰذا اس عہد کا خدا اس کا عہد کا پیغمبر نعوذ باللہ۔Capital ہے لہٰذا تمام انسانی رشتے تعلقات معاملات صرف اور صرف پیسے Capital کے ذریعے جانچے، مانے اور ناپے جارہے ہیں، پیسہ ہی منہاج علم ہے، پیسہ ہی وہ کسوٹی ہے جو معاشرے میں کسی فرد کے مقام و مرتبے کا تعین کرتا ہے لہٰذا پوری دنیا نفس پرستی کے مذہب پر ایمان لے آئی ہے اور پیسے کی دوڑ میں شریک ہو کر اپنی اقدار روایات، تہذیب، تاریخ، رسوم و رواج کو تاراج کر رہی ہے۔اب جاوید احمد غامدی مغرب کے اس فلسفۂ مذہب انسانی، فلسفہ الوہیت حیوانی کی مذہبی تعبیریں پیش فرما رہے ہیں۔جاوید غامدی صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ڈیکارٹ کے فکر پر مبنی فلسفے کی بنیاد محض شک ہے یہ انسانوں کے ذہن کی تخلیق ہے

اس کا کوئی پہلو حتمی، قطعی اور آخری نہیں ہے یہ کسی بھی لمحے تبدیل ہوسکتا ہے یہ فلسفہ قرآن کی آیات نہیں جس میں تغیر وتبدیل کی گنجائش نہیں، پھر اس فلسفے کو قطعی اور حتمی ماننے کا جواز انھوں نے کہاں سے اخذ کیا ہے۔ فلسفہ کیا ہے، کسے کہتے ہیں مختصراً فلسفے کی اہم تعریفیں درج ذیل ہیں:

[1] "The love of wisdom." [2] "Philosophy is the name for a subject area of study". [3] Philosophy is a term to identify an individual's general approach to life". [4] Philosophy is the identification of the presuppositions and assumptions underlying a subject matter [for example, the philosophy of science, the philosophy of history, and so forth]; [5] Philosophy as a techniques to clarify the way language is used. [6] Philosophy is an activity undertaken by human beings who are deeply concerned about who they are and what everything means, and that a philosopher is a person who perceives in some measure the ways in which the various experiences and awarenesses of existence form a pattern of meaning. [7] Philosophy, without apology, forcefully directs attention to the relentless efforts of human beings to achieve an organized view of themselves and the universe in which they live.

فلسفے سے ناواقف لوگوں کے لیے اس بیان کی مزید تشریح درج ذیل ہے:

"Philosophic study means the habit of always seeing an alternative". This statement, by the American philosopher William James, introduces another aspect of the issue approach to philosophy. The issue approach exposes students to a provocative variety of positions taken by philosophers on major questions. By

examining this diversity of ideas students are forced to speculate about the range of the possible. The aim is to stretch the mind, to explore the realm of the conceivable. By scanning the horizon in many directions, students can more firmly fix their own positions or the positions of others.

فلسفہ ہمیشہ متبادل کا متلاشی رہتا ہے جو غامدی صاحب کا پسندیدہ مشغلہ ہے، فلسفہ ہر شے کو سوال کی تلوار پر رکھ لیتا ہے لیکن کسی سوال کا حتمی قطعی جواب نہیں دیتا۔ کھلا ذہن فلسفہ کا ثمر ہے جس کا مطلب ہے ایک ایسا آدمی جس کا منہ ہمیشہ کھلا رہے جو ہمیشہ سوالات اٹھاتا اور اعتراضات کرتا رہے۔ غامدی صاحب کا یہی طریقہ کار ہے جسے فلسفہ کی تعلیم کے دوران غامدی صاحب نے طرز حیات کے طور پر اختیار کرلیا ہے۔

The philosophy questions everything and settles nothing, some reassurance may be found in the words of the late English journalist-critic G.K. Chesterton, who remarked: "Merely having an open mind is nothing. The object of opening the mind, as of opening the mouth, is to shut it on something solid."

فلسفے کی ان مغربی تعریفوں کے بعد جاوید غامدی صاحب یہ بتادیں کہ حقوق انسانی کے مغربی فلسفیانہ منشور کو ایک اسلامی آفاقی منشور کیسے تسلیم کیا جائے؟ غامدی صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مغرب کے بڑے بڑے فلاسفہ نے حقوق انسانی کے منشور کو آفاقی [Universal] تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ عصر حاضر کے سرکاری امریکی لیکن اہم فلسفی رچرڈ رارٹی کہتے ہیں کہ یہ ایک خاص تاریخ وتہذیب سے برآمد ہوتے ہیں اور ان کو آفاقی کہنا ٹھیک نہیں ہے لیکن غامدی صاحب نے کبھی ان فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا۔ آئندہ شمارے میں ہم ان کتابوں کی فہرست پیش کریں گے۔ جن میں حقوق انسانی کے منشور کو آفاقی تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ جس منشور کو مغرب کے دانشور فلسفی آفاقی نہیں مانتے۔ غامدی صاحب اسے آفاقی اسلامی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں جس سے ان کی جہالت کا بخوبی اندازہ

کیا جاسکتا ہے۔

غامدی صاحب Humanism کا ترجمہ انسانیت نوازی کرتے ہیں۔ Humanity کا ترجمہ انسانیت کرتے ہیں اور اسے عین اسلام قرار دیتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ کسی بھی زبان اور فلسفے کے خیالات [Ideas] اور اصطلاحات [Terminology] کا ترجمہ یا ترجمانی کسی دوسری زبان میں ممکن ہی نہیں۔ انھیں ترجمے کی تنگ دامانی کا اندازہ ہی نہیں وہ زبانوں کے تراجم کی تاریخ، تراجم کی مشکلات سے قطعاً ناواقف ہیں۔ اس کی تفصیل آپ آگے ملاحظہ کریں گے۔ سردست ہم ان کے تصور انسانیت پر گفتگو کریں گے۔ مغرب میں کوپرنیکس کی کتاب سیاروں کی گردش The revolution of Celestial Spheres نے سائنسی دنیا میں انقلاب برپا کردیا جس کے باعث یونانی سائنس کا خاتمہ ہوگیا اور اس کے ساتھ ساتھ عیسائیت بھی منہدم ہوگئی۔ کیونکہ عیسائیت نے یونانی منطق، فلسفے اور سائنس سے مرعوبیت کے باعث یونانی سائنسی منطقی، فلسفیانہ، افکار و معتقدات کو عیسائی دینیات والٰہیات کا حصہ بنالیا تھا۔ اس بدعت و گمراہی کے نتیجے میں یونانی سائنس کا یہ احمقانہ مفروضہ کہ ''زمین ساکن ہے'' عیسائی عقائد کا لازمی حصہ قرار پایا جسے کوپرنیکس نے علماً اور عملاً غلط ثابت کردیا۔ اصلاً کوپرنیکس نے یونانی سائنس کی تردید کی تھی۔ لیکن اس کے نتیجے میں عیسائیت بھی رد ہوگئی اور مذہبیت کے خلاف سائنسی انقلاب برپا ہوگیا۔ کوپرنیکس نے پہلی مرتبہ یہ بتایا کہ اجسام سماوی زمین کے گرد گردش نہیں کرتے بلکہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ کانٹ نے اسی کوپرنیکسی انقلاب کو مابعد الطبیعیات اور علمیات میں برپا کیا اور اس نے تمام گردش کا محور انسان کو قرار دیا۔ دنیا کی اکیس تہذیبوں میں خدا مرکز و محور کائنات رہا اسے God procentic approach کہا جاتا تھا۔ کانٹ نے تاریخ فکر انسانی میں پہلی مرتبہ اس فکر کو تبدیل کرکے انسان کو محور مرکز کائنات قرار دے کر ایک نئے مذہب، نئی مابعد الطبعیات، کی بنیاد ڈالی جسے ہم آج مذہب انسان پرستی [Religion of human worship] کے نام سے جانتے، پہچانتے اور بلا تکلف اس پر ایمان لاتے ہیں۔ دیر و حرم کا اس مذہب پر اجماع ہوگیا ہے۔ روایتی طور پر مابعد الطبیعیات کا تعلق خدا کائنات اور روح اور تصور خیر و شر سے ہے۔ لیکن کانٹ نے اس مابعد الطبیعیات کو نقد کا نشانہ بنا کر مغربی بہیمیت کے لیے علمی بنیادیں فراہم کیں۔ اس کے خیال میں Metaphysic انسانی خودمختاری میں حائل ارادہ انسانی کی تحدید، اور انسان کے عقل کل ہونے کی نفی

کرتی ہے۔ لہٰذا اس کا انکار ضروری ہے۔ کانٹ نے بتایا کہ انسان کو صرف اپنی اتباع کرنی چاہیے یعنی انسان اپنے self کی پرستش کرے کیونکہ وہ خود پرستش کیے جانے کے قابل ہے وہ خود خدا ہے، خود خیر و شر کا ماخذ ہے اور اس کا نفس کائنات کے اسرار و رموز کا امین ہے اس اتباع کا نام خود مختاری و آزادی [Self determination, independence] ہے۔ خدا ہے یا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وجود خدا ثابت بھی ہو جائے تب بھی انسان کو خدا کے بجائے اپنے نفس کے آگے سر تسلیم ختم کرنا چاہیے۔ کانٹ کے اس فلسفے سے [Religion of humanism] کی بنیاد پڑی اور غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ مذہب انسانیت عین اسلام ہے۔ کانٹ نے یہ فلسفہ افادیت پسندی کے نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ اس کے خیال میں کسی بھی شے کے حق یا باطل، صحیح یا غلط ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ شے انسان کے لیے فائدہ مند ہے یا نہیں جو چیز انسان کے لیے فائدہ مند ہے وہ حق ہے خواہ خدا کچھ بھی کہے سوال یہ ہے کہ انسان کے لیے کیا فائدہ مند ہے کیا نقصان دہ اس کا تعین خود انسان کا Self نفس کرے گا یا کوئی اور کانٹ کہتا ہے کہ منہاج خیر و شر نفس انسانی ہے گویا خواہش نفس ہی الٰہ ہے جسے قرآن شرک کی بدترین قسم قرار دیتا ہے ایسے شخص کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوتی۔ جو اپنے نفس کا بندہ ہو۔ کانٹ کے اس فلسفہ مذہب انسانیت کی تفصیلی تشریح آپ اگلے مضمون میں ملاحظہ کر سکتے ہیں جس سے جاوید غامدی صاحب کی فلسفے سے ناواقفیت اور اسلام سے جہالت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ مختصراً کانٹ کی نظر میں سب سے ذلیل انسان وہ ہے جو اپنے نفس کے سوا کسی اور کے سامنے سر جھکائے خواہ وہ خدا ہی کیوں نہ ہو۔ ارادہ الٰہی کوئی خیر نہیں اصل خیر ارادہ انسانی ہے۔ اخلاقیات کی بنیاد ارادۂ الٰہی یا فطرت نہیں بلکہ ارادۂ انسان ہے۔ انسان صرف اپنے بنائے ہوئے قوانین کا فرماں بردار ہے اس کے سوا کوئی فرماں برداری جائز نہیں۔ انسان کا اصل مقصد مفادات انسانی اور خود مختاری کا تحفظ ہے لیکن بے چارے غامدی صاحب اور ان کے ہم خیال جاہل مسلم مفکرین مذہب حقوق انسانی کو عین اسلامی ثابت کر رہے ہیں۔

جاوید غامدی صاحب کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے آنرز کیا تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی پڑھ لی اور فلسفہ بھی ایک جزوی مضمون کے طور پر زیر مطالعہ آیا۔ لہٰذا فلسفے کے گمراہانہ خیالات سے متاثر ہو گئے اسی لیے افلاطون نے کہا تھا کہ چالیس سال کی عمر تک فلسفہ پڑھنا چاہیے تب فلسفے کی تعلیم مکمل ہوگی اور اس کے بعد دس سال تک King فلسفی کو عام لوگوں سے تمام امور پر

تبادلہ خیال کرتے رہنا چاہیے تا کہ اس کا تزکیہ اور تصفیہ قلب ہو سکے کیونکہ فلسفہ ایک خطرناک ہتھیار ہے جس سے فلسفی اپنا گلا بھی کاٹ سکتا ہے اور دوسروں کا بھی۔ افلاطون کے یہاں بادشاہ کا فلسفی ہونا ضرور تھا تا کہ وہ دانش و بینش سے کلی طور پر آگاہ ہو۔ غامدی صاحب نے ۲۵ سال کی عمر میں علم بگھارنا شروع کیا لہٰذا اپنا اور عالم اسلام کا گلا فلسفہ کے اس کند ہتھیار سے خود ہی کاٹ ڈالا۔ افلاطون کا اندیشہ کئی صدیوں کے بعد درست ثابت ہوا۔ غامدی صاحب فلسفہ پڑھتے ہی مسند درس وارشاد پر بزعم خود فائز ہو گئے۔ جہلا ان کے اردگرد جمع ہو گئے، ان اجہلوں میں یہ راجہ اندر تھے لہٰذا سب ان کے غرورِ علم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور جاہلوں کا ایک کاروان تیار ہو گیا جو نہ عربی جانتے ہیں نہ علوم اسلامی سے واقف ہیں نہ مغربی فلسفے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس جاہلیت اور جہالت کے باعث غامدی صاحب نے مغربی فلسفیانہ اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ پڑھ کر مغرب کے تمام ملحدانہ و کافرانہ خیالات کی اسلام کاری شروع کر دی۔

''تصورات کا اصل زبان میں باقاعدہ اور دِقت نظر سے مطالعہ کئے بغیر محض ترجمے کی بنیاد پر کسی قوم کی اخلاقیات، مابعدالطبیعیات، اعتقادات، الٰہیات کی نوعیت پر گفتگو غلط راہ پر ڈال سکتی ہے مثلاً صالح کا ترجمہ راست باز یا رائیٹیس [Rightiuous] درست نہیں یہ لفظ معنویاتی عناصر میں انگریزی کے اسم صفت سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا اسی طرح شنٹو اور کنفیوشس مذہب میں راستی اور انصاف کے تصورات کا انگریزی میں درست ترجمہ ممکن ہی نہیں کیونکہ جاپانی اور چینی زبان میں متعدد ایسے الفاظ ہیں جو انصاف اور راستی کے مفہوم کے مختلف مدارج سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انگریزی زبان اور ان مذہبی اصطلاحات میں موجود مبہم اشتراک اور ترادف کی بنیاد پر کیا گیا تقابلی مطالعہ جہالت کا مظہر ہوگا یہی حال غامدی صاحب کا ہے مغربی فکر و فلسفے اور تہذیب کی اصطلاحات کا ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ پروفیسر Morris Cohen نے اپنی کتاب A preface to logic میں لکھا ہے کہ ارسطو کے نیک آدمی کا تصور ''یونانی لفظ ''آرے تے'' کو انگریزی لفظ virtue کا مترادف، متبادل، مرادف سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے آرے تے کا بہتر مفہوم نیکی virtue نہیں عمدگی ہے جو قابل ستائش خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ ہائیڈیگر کے متن کے بعض حصوں کے انگریزی میں ترجمے آج تک نہیں کئے جا سکے۔

کسی زبان کے ترجمے کے ذریعے اصل زبان کے متن کے بارے میں جو معلومات مہیا ہوتی ہیں وہ بالواسطہ ہوتی ہیں اور ان پر قطعی انحصار نہیں کیا جا سکتا ترجمے میں الفاظ جملے اگر اصل عبارت کے

قریب ہوں تب بھی زیادہ سے زیادہ وہ جزوی مطابقت ظاہر کرتے ہیں اس ترجمے پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا یہ ناکافی اور بعض صورتوں میں گمراہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

اگر کوئی عبارت ہم اصل زبان میں بھی پڑھتے ہیں تو قطعاً لاشعوری طور پر ہم اس عبارت میں اپنے ہی تصورات، معتقدات، نظریات، ایمانیات، افکار، روزمرہ، اقدار، روایات پڑھنے لگتے ہیں جو ہماری مادری زبان، تہذیب، مذہب اقدار روایات نے ہمارے ذہن پر نقش کئے ہیں چنانچہ ہم اس عبارت کے اگر سارے نہیں تو بہت سے کلیدی الفاظ کے مفہوم کو اپنی مادری زبان میں دستیاب ملتے جلتے تصورات میں تبدیل کر کے سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

کسی اجنبی زبان کے الفاظ اصطلاحات کا مطلب معلوم کرنے کا عام اور سب سے سادہ طریقہ یہ ہے کہ اپنی زبان میں اس لفظ کا مترادف اور ہم معنیٰ لفظ تلاش کیا جائے بدقسمتی سے یہ طریقہ علمی حلقوں اور خصوصاً فلسفیانہ موضوعات اور اصطلاحات کے ضمن میں سب سے زیادہ غیر معتبر ہے۔ غامدی صاحب کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ انھوں نے مغربی فلسفے، ثقافت، تہذیب کی اصطلاحات کا اردو ترجمہ پڑھ کر ان کے وہ مفاہیم اپنے ذہن میں نقش کر لیے جو اسلامی تاریخ و تہذیب کی جلوہ گری سے متعلق ہیں۔ غیر زبان کا لفظ صرف لفظ نہیں ہوتا اس لفظ کی ایک خاص تاریخ تہذیب ثقافت، مابعدالطبعیات بھی ہوتی ہے۔ لفظ یا اصطلاح کا خمیر اس خاص تاریخی تناظر سے تیار ہوتا ہے اسے نظر انداز کر کے جو ترجمہ بھی کیا جائے گا وہ بے کار نا قابل قبول ہوگا جیسے مغربی اصطلاح مارکیٹ کا ترجمہ بازار، فریڈم کا ترجمہ آزادی، Equality کا ترجمہ مساوات Tolerence کا ترجمہ رواداری، ڈیموکریسی کا ترجمہ جمہور یا جمہوریت یا اجماع سراسر غلط ہے تصورات [Ideas] اور اصطلاحات [Terminology] اور اسماء کا تو ترجمہ ممکن ہی نہیں جس طرح اذان، حج، السلام علیکم محمد کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ اس تناظر کو رد کر کے آپ صرف لفظ کو غیر اقداری [Value Neutral] سمجھ کر ترجمہ کرتے ہیں تو قیامت آجاتی ہے۔ مثلاً عربی لفظ حماسہ کا مطلب میدان جنگ میں شجاعت، مصیبت میں صبر، حصول انتقام میں ثابت قدمی، کم زور کی حفاظت اور طاقت ور کے خلاف بغاوت کے سارے مفاہیم کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ مگر حماسہ کے سارے معانی کا احاطہ نہیں بلکہ ایک بہت ہی سرسری سا اور ابتدائی تخمینہ ہے لیکن یہ ابتدائی معانی بھی بہادری جرات یا حوصلے کے الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتے جو عام طور پر حماسہ کے ترجمے کے لئے استعمال ہوئے ہیں اسی طرح

لفظ جہل جسے عموماً علم کی ضد سمجھا جاتا ہے لیکن اصلاً یہ صرف علم کی نہیں بلکہ علم اور حلم کی ضد ہے۔ نفس کا سکون یونانی میں اتارکسیا Ataraxia کہلاتا ہے اس کا اردو ترجمہ ممکن نہیں ہر زبان میں ایسے الفاظ اور اصطلاحات ہوتے ہیں جن کا ترجمہ ممکن نہیں مثلاً انگریزی کے لفظ Humor فرانسیسی کے لفظ Esprit اور جرمنی کے Gemut عربی کا حماسہ، یونانی کا آرے تے Arete کا صحیح اور مکمل ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں ممکن نہیں۔ انگریزی لفظ Weed کے معنیٰ غیر ضروری ناپسندیدہ نباتات خودروسبزہ کا ایسی جگہ اگنا جہاں اس کی ضرورت نہیں۔ یہ لفظ ہی اصل میں کافرانہ ہے یہ لفظ وہ شخص کہہ سکتا ہے جو فطرت کائنات اور حقیقت کے نظریات سے لاتعلق ناواقف ایک خاص ذہنی مریض ہو جو خاص مابعدالطبعیات کا خوگر ہو۔ یونانی لفظ Logos کا ترجمہ بھی ممکن نہیں ڈاکٹر فاؤسٹ نے ہمت ہاردی تھی جب وہ گوئٹے کی کتاب کا ترجمہ کررہے تھے۔ ناقابل ترجمہ الفاظ دراصل کسی زبان کے بولنے والوں کے مخصوص ذہنی رویے کے حامل ہوتے ہیں صحیح بات یہ ہے کہ کسی لفظ کا بھی مکمل ترجمہ دوسری زبان میں ممکن ہی نہیں۔

اگر غامدی صاحب نسبتی لسانیات Ethnoliguistic سے واقف ہوتے اور دوسری زبانوں کے تصورات اصطلاحات، الفاظ کے ترجمے کے ضمن میں Proheo Weisberger کی کتاب Vom Weltbild der deutschen Sprache اور پروفیسر Edward spepir کے Ethnoliguistic سے متعلق خیالات کا مطالعہ کر لیتے تو مغربی فلسفے اور انگریزی زبان کی اصطلاحات کے غلط سلط ترجمے کر کے بنیادی انسانی حقوق Fundamental Human Rights کو اسلامی ثابت نہ کرتے اور جاہلیت زدہ مغربی تہذیب و فلسفہ کو اسلام کی اصل شکل اور توسیع شدہ قوت قرار نہ دیتے۔

غامدی صاحب نے Donal Evance کی کتاب The logic of Involvment اور Bejamin Lee Wharf Language Thought & Reality [Cambridge 1956] اور Paul Henle کی کتاب Language Thought & Culture کا مطالعہ نہیں فرمایا۔ بینجمن وہارف کے خیال میں مغربی اور ہند یورپی زبان بولنے والوں کی دنیا بالکل الگ الگ ہے مغرب کے یہاں گول مربع مستطیل مکعب، ٹھوس، مائع کی درجہ بندی یکساں ہے جب کہ ہند یورپی زبان بولنے والوں کے یہاں اس کے اصول الگ ہیں وہ کہتا ہے کہ مغربی اقوام کی درجہ بندی کے اصول غیر منطقی

اور غیر معقول ہیں کیوں کہ وہ حقیقی دنیا کے نظام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔

بنجمن وہارف کو حیرانی ہوئی کہ ہند یورپی زبانیں بولنے والوں سے الگ ایک ایسی دنیا بھی موجود ہے جو چیزوں کی درجہ بندی ان کی بنیادی شکلوں یعنی گول، مربع، مستطیل، مکعب، ٹھوس، مائع وغیرہ کے حساب سے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک گول چیزوں کی درجہ بندی مربع چیزوں کے ساتھ نہیں ہوسکتی، ان دونوں کے لیے الگ الگ نام ضروری ہیں۔ ان کے حساب سے مغربی اقوام کی درجہ بندی کے اصول غیر منطقی اور غیر معقول ہیں کیونکہ وہ حقیقی دُنیا کے نظام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ گول اور مربع دو مختلف اشیاء کو ایک ہی درجہ میں رکھنا کیسے ممکن ہے؟

اس سادہ سی مثال سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ نام اور چیز میں مطابقت کسی مادی، معروضی، سادہ اور یکتا بنیاد پر نہیں۔ ان دونوں کے درمیان ہمیشہ ایک مخصوص ذہنی عمل کارفرما رہتا ہے۔ یہ ایک تخلیقی عمل ہے جو ایک مخصوص زاویہ نظر سے کسی چیز کو داخلی حوالے سے شکل دیتا ہے۔ میز کی مثال میں یہ مخصوص زاویہ اس چیز کی عملی افادیت کا پہلو ہے، اس میں میز کی مربع یا گول شکل کا اختلاف بے معنی ہے۔ اس کے استعمال کی بنا پر دونوں شکلوں کو ایک نام دیا گیا۔ چونکہ دونوں شکلوں کے میز ایک ہی مقصد کے لئے ہیں، اس لئے ظاہری اور صوری اختلاف قدرتی طور پر غیر اہم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں کے نزدیک چیزوں کی شکل وصورت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ دُنیا کو شکل وصورت کے اعتبار سے دیکھتے ہیں، مقصد اور استعمال کی بنیاد پر نہیں۔

ڈاکٹر فاؤسٹ گوئٹے کی کتاب کے ترجمے میں یونانی لفظ Logos کا جرمن معنی تلاش کرتے کرتے تھک گیا اس تھکن اور اس مشکل کا اصل سبب یہ تھا کہ نا قابلِ ترجمۂ الفاظ دراصل کسی زبان کے بولنے والوں کے مخصوص ذہنی رویے کے حامل ہوتے ہیں۔ تاہم اس مخصوص رویے کی یہ چند مثالیں محض وضاحت کے لیے پیش کی گئیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ کسی لفظ کا بھی مکمل ترجمہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے۔ ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ میز کا ترجمہ آسان اور لوگوس کا مشکل ہے، لیکن در اصل یہ فرق اتنا زیادہ نہیں جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ صحیح معنوں میں دونوں کا ترجمہ مشکل ہے۔

ہم جو لفظ بھی بولتے ہیں، وہ ہمارے اس مخصوص زاویۂ نظر کی غمازی کرتے ہیں جس سے ہم اس لفظ کا تصور کرتے ہیں۔ یہ تصور اسی داخلی رویے کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ

زاویۂ نظر مختلف چیزوں کی شکلیں تیار کرتا ہے جو کم و بیش مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ انہی شکلوں کو ہم تصور کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں زاویۂ نظر کے داخلی ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر فرد کا اپنا اپنا زاویۂ نگاہ ہے۔ ہم جس زاویۂ نظر کی بات کر رہے ہیں، وہ انفرادی نہیں اجتماعی ہے کیونکہ پورا معاشرہ اس میں شریک ہے۔ یہ ایسا مشترکہ سرمایہ ہے جو نسل در نسل تاریخی روایت کی شکل میں منتقل ہوتا ہے۔ ہم اسے داخلی اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اس کی تشکیل میں کسی حد تک ایجابی ذاتی مفاد کو دخل ہے جس کی وجہ سے کائنات کے بارے میں یہ تصوراتی تصویر باہر کی دنیا کے ٹھوس حقائق کی بعینہٖ نمائندگی نہیں کرتی۔ علمِ معنویات انہی زاویوں کے تجزیاتی مطالعے کا نام ہے جو لفظ اور تصور کے باہمی رشتے کے ذریعے معانی پیدا کرتے ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ہر قوم اپنے طریقے سے طے کرتی ہے کہ حقیقت کے کُل میں سے کیا الگ کرنا ہے اور کس حساب سے کرنا ہے۔ یا یوں کہیے کہ صورتوں کو الگ کرنے کے عمل کا انحصار ہمیشہ کسی قوم کی داخلی دلچسپی کے معیار پر ہوتا ہے۔ یہی معیار اس عمل کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ تعین مادی اشیاء میں معروضی طور پر باہمی مشابہت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ اس داخلی معیار پر ہوتا ہے جس سے ان چیزوں کی خانہ بندی کی جاتی ہے۔ حقیقت کا جو روپ ہماری اُمید و بیم، رغبت و تصمیم اور خواہش و عمل کو اہم دکھائی دیتا ہے، صرف اسی کو الگ اور مستقل جزو کی حیثیت سے ایک الگ نام دے کر ایک الگ حقیقت قرار دیا جاتا ہے۔ اس ذہنی حقیقت کو ہم 'تصور' کہتے ہیں۔ ہر لمحہ تیزی سے بدلتے بہتے تاثرات میں سے ہم صرف ان چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں جو ذاتی داخلی دلچسپی کی حامل ہوتی ہیں، یا ہم جنہیں نظامِ زندگی کے لیے مجموعی طور پر لازمی سمجھتے ہیں۔ اس طرح ہم ان چیزوں کو جو ایک غیر متعین اور ہر لمحہ تغیر پذیر کل کا جز ہیں، اپنے اس نقطۂ نظر سے متعین کرنے کی غرض سے اس کے لیے ایک لفظ مخصوص کر دیتے ہیں۔ اس لغوی چھاپ کے عمل کو 'نام' کہا جاتا ہے۔

کائناتی وجود کے مواد کو جو دراصل بے شکل ہے، انسانی ذہن اَن گنت خطوط کھینچ کر مختلف خانوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ حقائق کی دنیا پر لسانی اور تصوراتی تقسیم کے نقوش ثبت کر دیے جاتے ہیں۔ اور یوں اصلاً ایک بے ہنگم وجود کو ایک نظام اور ترتیب دے دی جاتی ہے۔ تصورات اور الفاظ جو اُن تصورات کے اظہار کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مل کر ایک پیچیدہ نظام تشکیل دیتے ہیں۔ یہ نظام

متعدد مظاہر میں نظر آتا ہے۔ یہ نظام انسانی ذہن اور مادی اشیاء کے درمیان ایک پردہ بن جاتا ہے۔ جو حقیقی وجود کی جگہ تصورات کے ذریعے تشکیل دیے ہوئے وجود کو منعکس کرتا ہے۔ پردے کے اس مخصوص عمل کی وجہ سے انسانی ذہن تک جو حقائق پہنچتے ہیں، اُن کی شکل ترمیم شدہ حتیٰ کہ بعض اوقات بگڑی ہوئی ہوتی ہے۔

ہم حقائق کو اس پردے کے ذریعے دیکھنے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ یہ پردہ ہمیں بالکل شفاف اور قدرتی لگتا ہے اور پھر بتدریج ہمیں اس کے وجود کا احساس بھی نہیں رہتا۔ اپنی سادہ لوحی میں ہمیں پورا یقین ہوتا ہے کہ ہم حقائق کی دُنیا کو بالکل اُسی طرح محسوس کر رہے ہیں، جیسا کہ وہ فطری طور پر اصل میں ہے، اور ہم اسے براہِ راست دیکھ رہے ہیں۔ عام فہم نقطۂ نظر کے حساب سے فطری اور حقیقی، دُنیا اپنے اظہار کے پیرایوں اور گوناگوں تنوع کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے بدیہی طور پر موجود ہے۔ ہم اسے بالکل اسی تفصیلی درجہ بندی اور مکمل نظم کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، جیسا کہ وہ اصل میں ہے۔ ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم دُنیا کا ادراک جس ترتیب اور تقسیم سے کر رہے ہیں، وہ اصل میں بھی اسی طرح موجود ہے۔ ہم اس فطری تنوع اور تقسیم کے مطابق اپنے ذہن میں تصورات قائم کرتے ہیں، چیزوں کو نام دیتے ہیں اور اس طرح ہمارا ذخیرۂ الفاظ تشکیل پاتا ہے۔

یہ عام فہم نقطۂ نظر ایک اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ حقیقت کلی کا ادراک تو ایک طرف [اسے تو یونانی حکماء بھی فوضی یا بدنظمی کا نام دیتے تھے]۔ ہم حقیقت کے کسی ایک جز کا بھی صحیح ادراک نہیں کر سکتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم حقیقت کے کسی بھی پہلو کو جتنے اجزا میں چاہیں اور جس طرح چاہیں اور جس زاویے سے چاہیں تقسیم کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ وجودی فلسفی کہتے ہیں کہ زندگی کے ہر لمحہ بہ لمحہ تجربات و واقعات کے خام مواد کو جب تک ہم اس ذہنی عمل کے ذریعے متفرق مستقل ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کر لیتے، ہمیں یہ دُنیا قطعی طور پر بے صورت اور بے معنی لگتی ہے۔ تقسیم کے اس ذہنی عمل کو علم معنویات میں اظہار یا بیان [Articulation] کہتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ہم اظہار کا یہ عمل خود وضع کریں۔ یہ نظام ذخیرۂ الفاظ کی صورت میں ہمیں استعمال کے لئے تیار ملتا ہے۔ یہ ذخیرہ ہمیں اپنے آباء واجداد کی جانب سے ثقافتی ورثے میں حاصل ہوتا ہے۔ بچپن میں جب ہم مادری زبان سیکھتے ہیں تو یہ ذخیرہ اپنے ذہن میں محفوظ کرتے جاتے ہیں۔

وجود کی حقیقت کچھ بھی ہو، وہ ہمارے تصور میں اپنی اصلی اور فطری شکل میں نہیں نظر آتا، بلکہ وہ ہماری زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں موجود علامات کے منشور سے گزر کر سامنے آتا ہے۔ علامت کا یہ منشور اصل کا عکس نہیں ہے اور نہ ہی علامات حقیقت کی اصل شکل سے کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔ یہ تو تصوراتی شکلیں ہیں، لیکن صرف انہی کے واسطے سے کوئی چیز ہمارے عقلی ادراک میں حقیقت کی شکل دھارتی ہے۔

اس ضمن میں سب سے اہم قابلِ غور بات صرف یہی نہیں کہ کائنات کو مختلف اکائیوں میں تقسیم وتفریق کا ہر قوم کا اپنا طریقہ ہے، بلکہ اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ یہ اکائیاں مل کر جو نظام تشکیل دیتی ہیں، وہ بھی ہر قوم سے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ نظام کسی ترتیب اور اصول کے بغیر وجود میں نہیں آتے بلکہ یہ اکائیاں مل کر ایک بہت ہی پیچیدہ اور منظّم کل بناتی ہیں۔ اس قوم کا خاصہ صرف وہ نظام ہی نہیں، جس میں یہ اکائیاں ایک دوسرے سے جڑی نظر آتی ہیں۔ بلکہ ہر قوم اپنے مخصوص طریقے سے یہ تعین کرتی ہے کہ کس اکائی کی کیا ماہیت ہے اور اس کا درجہ اور مقام کیا ہے۔ یہ منظّم کل ذخیرۂ الفاظ کی صورت میں ہر قوم کا اپنا سرمایہ ہوتا ہے۔

ذخیرۂ الفاظ یا عام الفاظ میں زبان یا لغت دلالت کے مختلف پیرایوں پر مبنی اظہار اور بیان کی شکلوں کے نظام کا نام ہے جس کے ذریعے ہم ہر لمحہ بدلتی کائنات کو اشیاء اور واقعات کی صورت میں دیکھتے ہیں۔

بنجمن وہارف کا خیال ہے کہ ہر زبان حقیقت کے وقتی تجزیے کا نام ہے کیونکہ ہر زبان کائنات اور فطرت کے وجود کو مختلف طریقوں سے اکائیوں میں بانٹتی ہے حتی کہ ایک عام سا واقعہ بھی مختلف زبانوں میں مختلف طریقوں سے بیان ہوتا ہے کیونکہ یہ زبانیں اس واقعے کو حقائق کے مختلف پیمانوں سے ناپتی ہیں۔ ہر زبان اپنے طریقے سے ان اکائیوں کو گروہ بندی کے مختلف قسم کے متعدد بنیادی اصولوں کے تحت ترتیب دیتی ہیں۔ پھر اُن کی مدد سے تصورات کا ایک مربوط جال بُنا جاتا ہے۔ اس جال کو ذخیرۂ الفاظ کہتے ہیں۔ تصورات کو بیان کرنے کا جال یعنی ذخیرہ الفاظ جب صرف انسانوں کے فہم، علم، عقل، نفس، تجربات پر انحصار کرتا ہے تو ایک خاص زمان و مکان میں مقید، محدود، محصور اور مجتمع رہتا ہے لیکن اظہار بیان جب وحی الٰہی اور پیغمبروں کے ذریعے عمل میں آتا ہے تو یہ پیغام، اس کی زبان، صرف مقامی نہیں رہتے آفاقی ہو جاتے ہیں اور زماں و مکان کی قید سے اوپر اٹھ جاتے ہیں اس لیے تمام انبیاء کا پیغام کل عالم کے لیے

ایک ابدی حقیقت کو پہچاننے کا پیغام ہے اور تمام انبیاء کی دعوت، اسلوب، پیغام، ہدف، منزل بنیادی طور پر ایک ہی رہی ہے لہٰذا وحی الٰہی اور ذات محبوب الٰہی ہی وہ مستند ذریعہ ہے جو محدود زبان کے ساتھ ایک آفاقی خیالات، آفاقی تصورات اور آفاقی پیغامات کی ضمانت ہے۔

کسی بھی زبان کا ذخیرۂ الفاظ یا نظامِ دلالت ایک مخصوص تصورِ کائنات سے مجسم ہوتا ہے اور اسی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ تجربے کے خام مواد کو ایک بامعنی اور تعبیری دُنیا میں تبدیل کرتا ہے۔ ان معنوں میں ذخیرۂ الفاظ صرف ایک سطحی عمارت نہیں بلکہ یہ ذیلی درجہ کے ذخیرۂ الفاظ کی متعدد سطحوں پر تعمیر کی گئی ہے جو عام طور پر ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے پہلو میں بنی ہیں، لیکن اکثر ان کے رقبے باہم مشترک بھی ہوتے ہیں۔ اشتراک کا بنیادی سبب ہر قوم میں انبیاء کی آمد اور ان کا مشترکہ پیغام حق بھی ہے اس لیے بنیادی اخلاقیات تمام تہذیبوں میں کم سے کم قدر مشترک ہے۔''

غامدی صاحب کا المیہ یہ ہے کہ انھوں نے عربی انگریزی زبانوں اور فلسفے میں عبور حاصل کیے بغیر کچے پکے خیالات ترجمہ کے ذریعے سرقہ کیے اور یہ ترجمہ بھی تسامحات سے پر تھا لہٰذا وہ مغرب کی تفہیم سے قاصر رہے اور عربی زبان پر عدم عبور کے باعث علوم اسلامی کی اصل تک نہ پہنچ سکے۔

ترجمے کے فن سے ناواقفیت کے باعث جناب جاوید غامدی صاحب نے وہ بھیانک غلطیاں کیں جو اسلامی تاریخ و تہذیب میں سرسید، عبدہٗ اور غلام احمد پرویز سے بھی سرزد نہ ہوئیں۔ کیونکہ ان حضرات نے فلسفے کے میدان میں سفر سے گریز کیا۔ غامدی صاحب اترا کر چلے اور چکرا کر گرے۔ اور پھر گرتے ہی چلے گئے۔ جب کوئی چیز نشیب کی طرح چلتی ہے تو لڑھکتی چلی جاتی ہے، کسی گہرائی میں گرتی ہے تو پاتال تک گرتی ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

غامدی صاحب مغربی تہذیب اور اس کی تاریخ سے بھی ناواقف ہیں لہٰذا وہ مغرب سے آنے والے ہر خیال، ہر تصور اور نظریے کی اسلام کاری پر تلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے مغربی فلاسفہ کی مغرب کے فلسفے، سائنس و ٹیکنالوجی پر تنقید نہیں پڑھی۔ مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں پر مغرب کے اہم لوگوں کی تنقید سے وہ ناواقف ہیں لہٰذا مغرب پر ایمان بالغیب کے ساتھ وہ اپنے فکری ایمان کا اعلان کرکے اپنے علمی سفر کا آغاز کرتے ہیں اور قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔ اگر وہ صرف ہزرل کی کتاب Critiques on uropeans sciences اور ہائیڈیگر کی کتاب Question Concerning

Technology پڑھ لیتے تو ان کے بہت سے شبہات رفع ہو جائے۔ مغرب کے فلاسفہ کا خیال ہے کہ جدید انسان ایک قسم کی غلامی سے آزاد ہو کر دوسری قسم کی بدترین غلامی یعنی مشین اور ٹیکنالوجی کا غلام بن گیا ہے۔ مطلقیت اور آفاقیت کے خواب بکھر گئے۔ اس کی جگہ اضافیت بے معنویت، بے مقصدیت، بے اطمینانی، بددلی بے زاری، سکہ رائج الوقت بن گئے، کسی لفظ کے کوئی معنی نہیں چنانچہ کسی خیال کسی قدر کے کوئی معنی نہیں لہٰذا کسی قدر کسی نقطہ نظر، کسی فکر کسی گفتگو، کسی سوچ، کسی خواہش کے کوئی معنی نہیں، جس تہذیب و تاریخ نے یہ نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں۔ غامدی صاحب اس تہذیب کی برتری کے لیے کوشاں ہیں اور عالم اسلام کو مغربیانے میں شب و روز مصروف ہیں۔ جدید طرز زندگی کے مظاہر و آثار پر ایرش فرام کے نقد سے غامدی صاحب ناواقف ہیں اگر وہ فرام کی کتابوں

[1]The sane society 1995. [2] The Revolution of hope. [3] Escape from freedom 1941. [4] The art of Loving 1956. [5] The forgotten Language 1960, [6] To have or to be.

کا مطالعہ کر لیتے تو ان کے بہت سے واہمے دور ہو جاتے، وہ بتاتا ہے کہ جدید تہذیب نے ایک غیر ہوش مند معاشرے کو جنم دیا ہے۔ عقل کی خدائی نے انسان کو تاریخ کی بدترین غلامی میں مبتلا کر دیا ہے۔ سرمایہ داری اور صنعتی دور نے انسان کی اصل فطرت، اور جذبات کو مسخ کر دیا ہے۔ جدید انسان غیر صحت مند بیمار مریض ہے۔ مادی آسائشوں کا طلب گار جدید انسان ایک دوسرے کو کچلنے میں مصروف ہے۔ بے اندازہ مادی ترقی اس کے زوال کا اہم عنصر ہے۔ جدیدیت نے نئے مذہب کو جنم دیا ہے جس کا نام ترقی ہے جو انسان کو خدا کی بستی کے بجائے ترقی کی بستی اور غلامی کی پستی تک پہنچاتا ہے۔ صنعتی انقلاب نے ثابت کر دیا ہے کہ Great Promise عظیم وعدہ ایک فریب تھا کیونکہ لامحدود لذات کا حصول لامحدود بے چینی، لامحدود گناہ گار زندگی، لامحدود بیماریوں، تکالیف، خباثتوں کو جنم دینے کا باعث ہے۔ اس کے خیال میں عصر حاضر کے انسان کی بنیادی بیماری حاصل کرنے [To achieve] کی خواہش ہے۔ حرص، لالچ، بے اطمینانی ایک نہ مٹنے والی بھوک ایک نہ مٹنے والی پیاس عہد حاضر کے انسان کا مقدر بنا دی گئی ہے جس کا اصل سبب مغربی و یورپی سائنس و ٹیکنالوجی ہے۔ جدیدیت نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا ہے جو زندگی کو خودکشی کی راہوں پر لے جا رہی ہے۔ فرام نے مغرب میں انسانوں پر جبر کی طویل کہانی بھی تحریر کی

ہے۔ جدیدیت، مغربی فلسفے، مغربی سائنس اور مغربی ٹیکنالوجی نے یک رخے انسان کو جنم دیا ہے جو جاوید غامدی کا پسندیدہ انسان ہے۔ اس انسان کی بیخ کنی ہربرٹ مارکوزے [Herbert Marcuse] نے اپنی کتاب One dimensional man میں کی ہے۔ مارکوزے کا تعلق فلسفے کے فرانکفرٹ اسکول سے ہے مارکوزے کی کتاب انسانی تہذیب کے عروج وزوال کی ایک المناک داستان اور صنعتی انقلاب اور روشن خیالی [Enlightenment] کے دور کی پرسوز کہانی ہے۔ اس کے خیال میں انسانی تہذیب کا تنزل سترہویں صدی کی روشن خیالی کے دور سے شروع ہوگیا۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں اب مزدور کے لیے دو وقت روٹی حاصل کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ لیکن انسان سائنس وٹیکنالوجی کی چکا چوند میں دیکھنے، کہنے، سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوگیا ہے۔ یہ سائنس وٹیکنالوجی بدترین انسان دشمن ہے۔ مزدوروں کے اعلیٰ معیار زندگی نے سرمایہ داروں اور سرمایہ داری پر تنقید کے دروازے بند کردیے ہیں۔ معاشرتی جبر تاریخ میں کبھی اس قدر نہ تھا جو جدیدیت کے ذریعے ہر جگہ در آیا ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے جو دو کپڑوں میں خوش تھا اسے بیس جوڑے خریدنے پر اکسانا، جو پرانی کار ہی میں مگن تھا اسے نئی کار خریدنے پر مجبور کرنا، جو اپنی کٹیا میں مست تھا اسے عالیشان بنگلوں میں قرضوں کے ذریعے مقیم ہونے پر بھڑکانا عہد حاضر کا کمال ہے۔ ہر فرد سرمایہ، سائنس وٹیکنالوجی کی زنجیر غلامی میں باندھ دیا گیا ہے اور اس کے سحر میں مبتلا ہے۔ اسے زنجیریں، بیڑیاں نظر آرہی ہیں مگر وہ بخوشی اسے پہنتا چلا جارہا ہے۔ سچی ضروریات کے بجائے چھوٹی ضروریات زندگی نے انسانوں کو بدترین اقتصادی غلام بنادیا ہے۔ ٹیکنالوجی ضروریات کے لیے کام نہیں کررہی بلکہ ٹیکنالوجی انسان کو بتارہی ہے کہ اس کی ضروریات کیا ہیں؟ کیونکہ اس کا تعلق سرمایہ دار سے ہے اور سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے بل پر لوگوں کو بتاتا ہے کہ کیا چیز لوگوں کی ضرورت ہے؟ کیا ضرورت نہیں ہے؟ لہٰذا انسان سرمایہ داری کے آہنی پنجرے میں بند ہوگیا ہے جس کا دوسرا نام روسی اور چینی اشتراکیت بھی ہے۔ فکر معاش ہر فکر پر فائق برتر اور غالب ہوگئی ہے۔ ہوس حسد کینہ حاصل زندگی ہے۔ مغرب کا انسان اندر سے بے حد دکھی ہے، تنہا ہے، غمزدہ ہے اس کا دل بجھا ہوا ہے مگر فریاد نہیں کرسکتا یہ سب کچھ اس لیے کہ آلاتی عقل یا عقل معاون Insturnmental reason کو ہر قدر، فکر، نظریے پر بالادستی حاصل ہوگئی ہے۔ عقل انسانی نے ایجادات واکتشافات کا ایک ایسا جال بچھا دیا ہے کہ اس سے نکلنا اب اس کے لیے ناممکن ہوگیا ہے۔ انسان تنقید عقل Critical Reason کا

استعمال بھول گیا ہے۔ اس کی یہ صلاحیت جدیدیت مغربیت اور عیش وعشرت کی زندگی نے سلب کر لی ہے۔ وہ آلاتی عقل کا غلام ہو گیا ہے۔ عہد حاضر کا انسان تاریخ انسانی کا وہ بدترین اور بدنصیب انسان ہے جو اپنے اوپر تنقید کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔ غامدی صاحب اگر مارکوزے کی درج ذیل کتابیں کا مطالعہ کریں تو شاید وہ مغرب کی اسلام کاری کے منصوبے سے تائب ہو جائیں۔

[1] Eros and Civilization 1955 [2] Reason and Revolution 1941. [3] One dimensional man - studies in the Ideology of adranced Industrial Soceity 1964. [4] Negations: Essays in Critical theory 1968. [5] Connter revolution and Revolt 1972.

عہد جدید کے انسان کے المیوں کی کہانی سننے، جاننے اور سمجھنے کے لیے غامدی صاحب روشن خیالی کی جدلیات کا مطالعہ کریں اور Adorno اور یاک ہائمر کی کتاب The dialectic of Enlightenment کا مطالعہ کریں تو وہ روشن خیالی کے فلسفے کو اسلامی ثابت کرنے کی خرافات سے بھی دستبردار ہو جائیں گے۔

عصر جدید کے سب سے بڑے فلسفی یرگن ہیبر ماس [Jurgen Habermas] کے افکار سے بھی غامدی صاحب قطعاً لاعلم ہیں۔ اس کی درج ذیل کتابیں:

[1] Towards a Rational Soceity: Student Protest, Science and Politic 1971 [2] Knowledge and Human Intrest 1972 [3] Theory and Practice 1973. [4] Legitimization Crisis 1976. [5] Communication and Evolution of Soceity 1979. [6] Theory of Communicative Action 1984. [7] The Philosphical discourse of Modrenity 1988. [8] Post Metaphysical Thinking 1992.

کا مطالعہ فرمالیں تو انھیں مغرب کی آفاقیت کے بہت سے دعوے غلط نظر آئیں گے۔ ہیبر ماس کی نظر میں Historical hermenuetic Sciences اور Emancipatory Sciences کی کیا اہمیت و حقیقت ہے۔ غامدی صاحب اس سے بھی قطعاً ناواقف ہیں۔ وہ مغرب کی تمام اقدار کو آفاقی اور اخلاقی

تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔اس کے خیال میں بیشتر اقدار خواہ وہ اخلاقی ہوں یا سماجی، اضافی ہوتی ہیں اور ہر دم بدلتی رہتی ہیں۔ ہر چیز قطعاً خیر، حق، اخلاقی اور آفاقی نہیں ہوتی، فلسفہ افادیت پرستی اقدار اور چیزوں کی حیثیت وحقیقت کو بدلنے کا اصل سبب ہے۔ وہ جدیدیت کی سرمایہ دارانہ شکل، سرمایہ دارانہ نظام، صنعتی انقلاب اور ٹیکنالوجی کی بالادستی کے بجائے نجاتی عقل پر زور دیتا ہے جو ایک ایسی جدید تہذیب کو وجود میں لا سکے جس میں انسان مشینوں کی غلامی سے آزاد ہو، اس کے برعکس غامدی صاحب عالم اسلام کے ہر فرد کو مغربی مشینوں سائنس وٹیکنالوجی کا بے دام غلام بنانا چاہتے ہیں۔

غامدی صاحب نے Alwin Toffler کی کتاب Future Shock بھی نہیں پڑھی ورنہ وہ مغرب کی سائنس وٹیکنالوجی اور جدیدیت کی حمایت سے دستبردار ہو جاتے۔ٹوفلر لکھتا ہے کہ دنیا کا مستقبل غیر محفوظ ہے۔امن کی کوئی ضمانت نہیں کب کیا ہو جائے گا کچھ پتہ نہیں، عصر حاضر میں معصوم بچے بڑے ہونے سے قبل ہی جوان ہو جاتے ہیں، بڑے اور بزرگ اب بچے معلوم ہوتے ہیں اور کمسن بڑوں سے بڑے لگتے ہیں، کسی کے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت نہیں سب آگے کی سمت بھاگنا چاہتے ہیں۔ طرز حیات ایک مبہم اصطلاح بن کر رہ گیا ہے۔Cultrual Shock نے جدید مغربی انسان کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔نئی دنیا ماضی سے اپنا ہر رشتہ توڑ چکی ہے۔سائنس وٹیکنالوجی سے آنے والی تبدیلیاں انسانوں کے لیے ایک آزار، مصیبت، جہنم بن گئی ہیں، ان کی مثال اس بیماری کی ہے جسے [Progeria] کہا جاتا ہے۔ مارچ ۱۹۶۷ء میں کینیڈا میں ایک گیارہ سالہ بچہ اس بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اس بیماری کے دوران اس کم عمر بچے پر جو علامات نمودار ہوئیں وہ نوے سالہ آدمی کے جسم پر رونما ہونے والی علامات سے مماثل تھیں۔ اس کی رگیں سخت ہو گئیں، سر سے بال اڑ گئے، جسم کی جلد پر جھریاں رونما ہو گئیں اور ذہنی کیفیت نوے سالہ سنکی کی سی ہو گئیں۔ گیارہ سال کی عمر میں نوے سالہ انسان کی علامات پانے والا یہ بچہ آخر کار مر گیا۔نئی سائنس ٹیکنالوجی سے عبارت اس نئی دنیا کا نیا انسان بھی اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہے تبدیلیوں کے طوفان کے ساتھ بھاگتے ہوئے وقت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت مسلسل کم، مفلوج اور ختم ہو رہی ہے۔ وہ ایسی تیز تبدیلی کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ثبات ایک بے معنی قدر ہے۔ یہ دور محض ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں'' کی مادی تفسیر ہے کسی شے کو محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز استعمال کرو اور پھینک دو ہر شے Disposable ہے ایک ایسا دور جہاں اشیاء کی قدر و قیمت محض وقتی ہو

وہاں انسانی اقدار کیسے پنپ سکتی ہیں۔ جب ہر شے پھینکنے کے قابل ہو تو پھر ماں، باپ، اقدار و روایات رشتے ناتے تعلقات کیسے محفوظ رکھیں گے؟ یہ بھی آخر کار پھینک دیے گئے ہیں۔ ٹوفلر فیوچر شاک کی سب سے بڑی وجہ ہائی ٹیکنالوجی کو قرار دیتا ہے۔ تشدد جرائم نقل مکانی دہشت گردی کا سبب یہ ٹیکنالوجی ہے اور غامدی صاحب اس کا دفاع کر رہے ہیں۔ یہ مغرب سے زیادہ مغرب کے وفادار ہیں۔ اس تمام تجزیے کے بعد ٹوفلر اس وحشت، بربریت، بہیمیت اور ہنگامہ خیزی سے بچنے کی تجاویز بھی دیتا ہے۔ کاش غامدی صاحب اس کتاب کو پڑھ لیتے اگر وہ اجازت دیں تو اس کا ترجمہ ان کی خدمت میں قسط وار پیش کیا جا سکتا ہے۔

غامدی صاحب مغرب کو اسلام سے ثابت کرنے سے پہلے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کر لیں تو نہ صرف ان کا بلکہ ان کے ذریعے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ مثلاً فوکالٹ کی کتابیں:

[1] Madness and Civilization. [2] The Architecture of Knowledge. [3]The birth of Clinic. [4] History of Sexuality

ایرش فرام کی کتابیں:

[1] The Heart of Man. [2] The anatomy of human Desructiveness

غامدی صاحب مغرب کے فلسفے، روشن خیالی، عہد جدید کے معجزات اور ان کے مضمرات کو سمجھنے کے لیے خاص طور پر درج ذیل کتابیں پڑھیں:

[1] Culler, Jonathan, on Deconstruction: Theory and Criticism after structuralism, 1982. [2]D, James and Williams, The Great Reckoning, 1992. [3] Derrida, Jacques, of Grammatology, 1975. [4] Derrida, Jacques. Writing and Difference, 1975. [5] Derrida, Jacques. Speech and Phenomena and Other Essays on Husserl's Theory of Signs, 1979. [6]Derrida, Jacques, Dissemination, 1981. [7] Derrida, Jacques, Margins of Philosophy, 1982. [8] Derrida, Jacques. Glas, 1986. [9] Derrida, Jacques. The Post Card: From

Socrates to Freud and Beyond, 1987. [10]Esposito, John L., The Islamic Threat: Myth or Reality?, 1992 [11]Fukuyama, Francis., The End of History and the Last Man, 1992. [12] Gadamer, Han-Georg, Reason in the Age of Science, 1981. [13]Gadamer, Han-Georg, Truth and Method, 1990. [14] Gellner, Ernest. Muslim Society, Cambridge, 1981. [15] Gellner, Ernest. Postmodernism, Reason and Religion, 1992. [16] Giddens, Anthony., The Consequences of modernity, 1990. [17] Giddens, Anthony., Modernity and Self-Identity: Self & Society in the Late Modern Age, 1991 [18] Lyotard, J. F. The Postmodern Condition: A Report on Knowledge, 1994. [19] Mortimer, Edward., Faith and Power: The Politics of Islam, 1982. [20] Nasr, Seyyed Hossein, Traditional Islam in the Modern World, 1987. [21] Nasr, Seyyed Hossein., The Need for a Sacred Science, 1993. [22] Sardar, Ziauddin, Science, Technology and Development in the Muslim World, 1977. [23] Sarup, Madan, An Introduction to Post structuralism and Postmodernism, 1993.

مغرب نے انسان کو اور اس کے نفس کو علم کا ماخذ قرار دینے کے بعد ہر انسان کو نفس کا بندہ نفس کا غلام بنا دیا۔ نفسانیت کی غلامی کے نتیجے میں ہزاروں سالوں سے قائم اجتماعیتیں [Collectivities] خاندان، قبیلے، برادری، گروہ، نسل، سب تہہ تیغ ہو گئے۔ عورت اور مرد کی مساوات کے نام پر دونوں کی آزادی نے خاندان کے ادارے کا خاتمہ کر دیا۔ آزادانہ شہوت رانی مقصد زندگی بنا تو کوئی عورت لذت ترک کرنے اور دردزہ کی اذیت سہنے کے لیے تیار نہیں۔ لہٰذا مغرب کی نسلیں مٹ رہی ہیں، گوری چمڑی والے دنیا کی کل آبادی کا صرف پانچ فیصد ہیں جو ۲۰۴۰ء تک گھٹ کر صرف ۳ء۱ فیصد رہ جائیں گے۔

لذت پرستی، نفس پرستی، Individndism، Freedom، Equality، Pleasurism، Positivism، Pregmatism کے نتیجے میں محبت، ایثار اور قربانی کی تمام روایتیں ختم ہوگئیں۔ دو دوستوں کی دوستی، ایک کمرے پر مشتمل چھوٹے سے کنبے کی بقاء، میاں بیوی پر مشتمل ایک چھوٹے سے خاندان کا استحکام۔ محبت اور ایثار و قربانی کے جذبے کے بغیر ممکن نہیں۔ محبت و قربانی کے بغیر ایک بچہ پرورش کے مراحل طے نہیں کرسکتا۔ ایک کمرے کا گھر محبت کے بغیر نہیں چل سکتا۔ دو دوستوں کی دوستی قائم نہیں رہ سکتی لیکن پوری مغربی تہذیب ان جذبوں کی نفی پر کھڑی کر دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بے بنیاد تہذیب ہے جو ایثار و قربانی کے ملبے پر زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکی۔ مغرب میں ایثار و قربانی کی تہذیب ققنس کی طرح اپنی خاکستر سے جنم لے گی اور اسلام کی آغوش میں آ کر رہے گی۔ بشرطیکہ جاوید غامدی جیسے جدیدیت پسند مفکرین منظر سے ہٹ جائیں۔ ایک دانشور کا بڑا عجیب نظریہ ہے لیکن حقیقت سے بہت قریب نظر آتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمان دنیا بھر میں آج کل مغرب کے ہاتھوں شکست کھا رہے ہیں اور زخم اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے کہ مغرب اسلام کا دشمن ہے لیکن آثار یہ نظر آتے ہیں کہ مستقبل میں مغرب اسلام کی آغوش میں آجائے گا اور عالم اسلام جاوید غامدی، قرضاوی جیسے دانشوروں کے ذریعے جدید بن کر مغربیت اختیار کرلے گا تب ''مسلمان مغرب'' دوبارہ عالم اسلام پر حملہ آور ہوگا تاکہ اسے ایمان و یقین کی منزل تک پہنچائے اور جدیدیت کے کفر سے آزاد کرے۔ یہ مسلمان آج مغرب سے اس کے کفر کے باعث مار کھائیں گے اور کل اپنے کفر یعنی جدیدیت کے باعث مغرب سے دوبارہ زخم سہیں گے، دانشور کا یہ تجزیہ درست نظر آتا ہے۔ عالم اسلام جس تیزی سے جدیدیت کے حصار میں جا رہا ہے۔ اس کے بعد یہی متوقع ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ عبدہٗ، سرسید، افغانی، غلام احمد پرویز، منظور احمد، جاوید غامدی اس کم زور حقیر تہذیب کو صرف اس کی سائنس و ٹیکنالوجی کی بنیاد پر دنیا کی طاقت ور ترین تہذیب تصور کر رہے ہیں۔ معذرت خواہی کی یہ آخری حد ہے۔

مسلم جدیدیت

اسلامی علمیت کے انہدام کے لیے جدیدیت پسند مسلم مفکرین کے چند طریقے

مرتبہ: سید خالد جامعی

ناظم، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی

عموماً تمام جدیدیت پسند مفکرین خواہ وہ راسخ العقیدہ ہی کیوں نہ ہو یا کسی راسخ العقیدہ روایتی مکتب فکر سے بھی مجبوراً وابستہ ہوں لیکن جیسے ہی وہ جدیدیت، مغربیت، اس عہد کے تمدنی مذہب [Civil religion] مذہب حقوق انسانی [Religion of Human Rights] اور اسلام میں ہم آہنگی تلاش کرنے کی شعوری، غیر شعوری، منطقی، عقلی کاوش شروع کرتے ہیں دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلامی علمیت کو غیر معتبر، مشکوک اور ناقابل یقین بنانے کے لیے کئی طریقے استعمال کرتے ہیں اس مضمون میں ہم فی الحال ان کے چند طریقوں کا تعارف اور تنقید پیش کریں گے بقیہ طریقوں کا تعارف اگلی قسط میں پیش کیا جائے گا۔

[ا] **عقل پرستی:** دعویٰ کرتے ہیں کہ عقل و نقل میں تضاد نہیں اگر ہوگا تو نقل کو عقل کے مطابق کر دیں کیونکہ دونوں یکساں درجے کے منہاج ہیں انسان کے پاس دو پیغمبر آتے ہیں ایک پیغمبر ظاہر جو رخصت ہو جاتے ہیں ایک پیغمبر باطن جو عقل کی صورت میں ہر فرد کو ہمیشہ میسر رہتا ہے، عقل کو ذریعۂ آلے کے بجائے ماخذ دین کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا یہ دعویٰ خود تضاد کا شکار ہے کیونکہ جب عقل و نقل یکساں درجے کے ماخذ ہیں تو عقل و نقل میں تضاد کی صورت میں صرف عقل کو نقل کے تابع کرنا غیر عقلی اور غیر منطقی رویہ ہے کیونکہ انہی کے اصول کے تحت نقل کو عقل کے تابع کرنے میں کوئی حرج نہیں لہٰذا آخر کار نقل عقل کے تابع ہو جاتی ہے اور پھر تابع مہمل بن جاتی ہے لہٰذا جدیدیت پسندوں کے یہ دعوے کہ عقل و نقل میں منافات ممکن نہیں اختلاف محال ہے کہ دین کی بنیاد علم و عقل کے مسلمات پر ہے تو یہ دعویٰ خود بتاتا ہے کہ نقل کی جگہ اگر عقل کو رکھ دیا جائے تو نتیجہ وہی نکلے گا جو نقل کے ذریعے نکلے گا لہٰذا عقل نقل کی محتاج نہ رہی اور انسان نقل کا محتاج نہ رہا کہ وہ عقل پیغمبر باطن کے ذریعے ہی نقل کی اصل تک پہنچ سکتا ہے لہٰذا عقل و نقل میں منافات کا انکار کرنے والے اصلاً

نقل کا ہی انکار کردیتے ہیں اور عقل کو اصل الاصول یعنی نص صریح قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود غازی مرحوم جیسے مخلص راسخ العقیدہ عالم جو ہرگز جدیدیت پسند نہیں تعقل غالب کے زیر اثر لکھتے ہیں ''شریعت کی اصل اور روح میں مذہب وعقل لازم و ملزوم ہیں عقل اور وحی دونوں شریعت کے ماخذ ہیں وحی الٰہی نے عقل کو شریعت کی تعبیر میں اہم ماخذ کی حیثیت عطا کی ہے ''محمود غازی ۲۰۰۹ء، عصر حاضر اور شریعت اسلامی ،ص ۳۴۵، ساتواں خطبہ علم کلام IPS اسلام آباد] حالانکہ جاوید غامدی جیسے متجدد بھی عقل کی بالادستی برتری کو قدم قدم پر تسلیم کرنے کے باوجود جب عقل کو چند مقامات پر نارسا، بے کس، بے بس، عاجز اور بے نوا پاتے ہیں تو بے اختیار تسلیم کرتے ہیں کہ اللّٰہ نے سورۂ نساء میں ورثاء کے حصے متعین کر کے اسے اپنی وصیت قرار دیا وجہ یہ بتائی گئی کہ انسان نہیں جانتا کہ ان رشتہ داروں میں کون بہ لحاظ منفعت اس سے قریب تر ہے [ص ۵۱۷ میزان ۲۰۱۰ء] انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تقسیم وراثت کے معاملے میں وہ انصاف پر مبنی کوئی فیصلہ کرسکتا کون بہ لحاظ منفعت اس سے قریب تر ہے وہ نہیں جانتا علم و عقل میں اس کے لیے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جاسکتی اس لیے یہ فیصلہ اس کا پروردگار ہی کرسکتا ہے انسان نہ رب کے علم کی وسعتوں کو پاسکتا ہے نہ اس کی حکمتوں کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے وہ اگر بندہ مومن ہے تو بس حکم سنے اور سر جھکا دے [ص ۵۲۲، ایضاً]۔ تادیب و تنبیھہ کس جرم میں کتنی اور کس طریقے سے ہونی چاہیے اس کی تعین کے لیے کوئی بنیاد چونکہ عقل انسانی کو میسر نہیں اس وجہ سے اللہ نے اپنے نبیوں کی وساطت سے انسان کو جو شریعت دی اس میں تمام بڑے جرائم کی سزائیں خود مقرر کردیں۔ [میزان، ص ۶۱۰، طبع سوئم مئی ۲۰۰۸ء، لاہور]۔

[۲] اصول استقراء ماخذ دین ہے: استقراء کو ایک آلے، ذریعے ہتھیار کے طور پر استعمال

کرنے کے بجائے استقراء کو بھی ماخذ دین کے طور پر استعمال کرتے ہیں جبکہ منطق کی کتابوں میں لکھا ہے کہ استقراء یقین کا فائدہ نہیں دیتا۔

[۳] **فطرت ماخذ دین ھے**: جدیدیت پسند فطرت کو بھی ماخذ علم کے طور پر استعمال کرتے ہیں مگر یہ نہیں بتاتے کہ کون سا انسان فطرت پر قائم ہے کونسا انسان فطرت مسخ کر چکا ہے فطرت پر قیام کو پرکھنے کا پیمانہ کیا ہوگا پیمانہ فطرت خود ہے یا پیمانہ باہر ہے کیا پیمانہ عقل ہے یا نقل ہے؟ حضرت آدم فطرت پر قائم تھے ان کو پیغام حق اللہ تعالیٰ نے براہ راست دیا تھا کہ شجر کے قریب نہ جاؤ مگر نقل کے سامنے عقل وفطرت ان کے کچھ کام نہ آئے وہ نسیان کے باعث خطا کا ارتکاب کر بیٹھے لہٰذا عقل وفطرت نقل کے تابع ہوں تو راہ راست بتا سکتے ہیں۔

[۴] **اسلام ھر زمانے کا ساتھ دے سکتا ھے**: لیکن سوال یہ ہے کہ زمانے کو پرکھنے کا پیمانہ کیا ہے؟ کیا زمانہ خود پیمانہ ہے یا زمانے کو نقل پر پرکھا جائے گا؟ ان کا خیال ہے کہ زمانہ ہمیشہ آگے بڑھتا ہے اور یہ زمانے کی فطرت ہے اسلام کو زمانے کے مطابق چلنا چاہیے ورنہ مسلمان زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔سوال یہ ہے کہ اگر رسالت مآبؐ زندہ ہوتے خلافت اسلامیہ باقی رہتی تو کیا زمانے کے رنگ ڈھنگ یہی ہوتے ظاہر ہے زمانہ تعقل غالب [Dominant Discourse] کے زیر اثر اپنے رنگ بدلتا ہے اسی لیے انبیاء کرام جب بھی آتے ہیں زمانے کو پیچھے کی طرف موڑتے ہیں اور وہ اپنے اصل سے رجوع کر لیتا ہے ہر پیغمبر نے اپنے سے پہلے پیغمبروں کی تعلیمات کی تصدیق اسی لیے کی اور زمانے کی رفتار کو روک کر اسے ماضی کی طرف پلٹا دیا۔اگر زمانہ خود ہی پیمانہ ہے تو پھر یہ نصوص دین میں نئے نص کا اضافہ ہے۔

[۵] **اجتھاد کے نام پر ماخذات دین میں اجتھاد**: اسلام میں اجتہاد قرآن وسنت اجماع و قیاس کی بنیاد پر ہوسکتا ہے مگر یہ حضرات اجتہاد کو آزادانہ عقلی سرگرمی تصور کرتے ہیں اور اجتہاد کے نام پر ماخذات دین میں اجتہاد کر دیتے ہیں۔

[۶] **مجتھد، فقیھہ، عالم دین غیر مسلم ھوسکتا ھے** کیونکہ اجتہاد، فقہ، فتوے علم کے لیے اصل شرط علم ہے ایمان اسلام تقویٰ و پرہیز گاری نہیں لہٰذا ہر غیر مسلم عالم سے جو اسلامی

فنون وعلوم کا ماہر ہو اسی طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے جس طرح مسلمان علماء فقہاء مجتہدین سے۔ دوسرے معنوں میں دینی علم کسی سے بھی لیا جا سکتا ہے اور تقویٰ، پرہیز گاری کا علم سے کوئی تعلق نہیں اور قرآن کی ان آیات کا وہ مفہوم بھی درست نہیں کہ **راسخون فی العلم** اور **علماء** ہی اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے لوگ ہیں یعنی خدا کے خوف سے عاری شخص بھی خدا کے فیصلوں کا حقیقی مقصد محض عقل اور علم کے ذریعے مسلمانوں کو بتا سکتا ہے اور مسلمان اس سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں علم کا عمل سے کوئی ربط نہیں مجرد علم ہی درست نتیجے تک پہنچنے کے لیے کافی ہے کہ یہ خالص عقلی، معروضی، آفاقی سرگرمی ہے لہٰذا ایک عابد زاہد تہجد گزار عالم اور غیر مسلم عالم کا نتیجۂ علم، اخذ، واستنباط یکساں سطح کا ہوگا۔ مشکوٰۃ میں آتا ہے **ان ھذا العلم الدین فانظرو اعمن تاخذون دینکم** یہ علم ہی تمہارا دین ہے تو یہ دیکھ لو کہ کس [شخصیت] سے تم دین یا [فکر] اخذ کر رہے ہو جدیدیت پسند اس اصول کو سرے سے تسلیم نہیں کرتے۔

[۷] **مغرب کی ترقی معیار ھے اسلام کو یھی ترقی مطلوب ھے** لہٰذا مغرب قابل تقلید ہے صرف **خذ ما صفا ودع ما کدر** کے اصول کا اطلاق کیا جائے جو بہتر ہو وہ لے لیا جائے جو خراب ہے اسے ترک کر دیا جائے مگر مغرب خود کیا ہے؟ اس کی ایجادات کے مقاصد کیا ہیں اس کا فلسفہ اس کی مابعد الطبیعیات کیا ہے؟ یہ اس سے قطعاً ناواقف ہیں لیکن اس کے باوجود مغرب کی تقلید کے لیے شرعی حیلے تلاش کرتے ہیں جو شخص مغرب کی جاہلیت سے کوئی خیر اخذ کرنا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ اس خیر کی مکمل تحقیق کرے مغربی علمیت اور اسلامی علمیت کا موازنہ کرے اگر وہ دونوں علوم پر عبور نہیں رکھتا اور تقابل کی صلاحیت کے بغیر اجتہاد کرتا ہے تو وہ جاہلیت کا شکار ہوگا اسی لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ شخص دین کی کڑیاں بکھیر دے گا جو جاہلیت کی حقیقت سے واقف نہ ہو لہٰذا **اخذ ما صفا و دع ما کدر** کے اصول سے اسی وقت استفادہ کیا جا سکتا ہے جب حقیقت جاہلیت سے کلی آگہی ہو۔

[۸] **نصوص کی ایک تعبیر نھیں متنوع تعبیریں ممکن ھیں** یہ دعویٰ مستشرقین کا تھا جسے علامہ اقبال نے خطبات کے ذریعے سہواً پیش کیا بعد میں خطبات کے مباحث سے رجوع

کرلیا تفصیلات کے لیے **امالی غلام محمد** مطبوعہ ساحل جون ۲۰۰۶ء، سہیل عمر کی کتاب **خطبات اقبال نئے تناظر** کا اختتامی صفحہ اور ضمیمہ ''سزا و نا سزا'' ملاحظہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے بعد پرویز صاحب، ڈاکٹر مشیر الحق نے نصوص میں تنوع کی غیر علمی دلیلیں پیش کیں جسے عمار خان ناصر صاحب نے اپنی خوبصورت تحریر کے ذریعے ''**حدود و تعزیرات چند اهم مباحث** ''میں ایک فلسفے کے طور پر پیش کیا اور جناب زاہد الراشدی صاحب نے اس فلسفے کی تائید سہواً یا قصداً فرمادی یعنی کوئی دائرہ علم یقینی نہیں ہے سائنس فلسفہ تو ہمیشہ غیر یقینی رہے اب نصوص بھی اسی سطح پر آ گئے عقلی اور نقلی علوم میں کوئی فرق باقی نہیں رہا انسانی علم ہی نہیں خدائی علم وحی الٰہی بھی متغیر ہو گئے مطلق حتمی ابدی نہیں رہے خالق و مخلوق اور ان کا علم دونوں یکساں درجے پر آ گئے یہ رویہ اجتہاد نہیں بدعت ضلالت اور الحاد ہے۔

[۹] **التوحید سب سے اهم هے روایت ازلی هے اورهر مذهب میں موجود هے تمام مذاهب کی تعلیمات ٹھیک هیں** صرف تشریح میں انحراف اور التباس و تحریف دین ہوتی ہے عقل کے ذریعے التوحید، واحد، حقیقت الحقائق تک پہنچا جا سکتا ہے اس مفروضے کا تجزیہ کریں تو یہ منصب رسالت کا انکار ہے۔

رسالت اور حدیث اسی لیے اہم نہیں ہے جنت و دوزخ کا فیصلہ توحید پر ہوگا نجات ایمان رسالت سے مشروط نہیں کہ توحید آفاقی ہے رسول ایک خاص قوم میں آتا ہے اور چلا جاتا ہے خدا باقی ہے قیوم ہے حیّ ہے لہٰذا خداوند کی معرفت ہی ایمان کی اصل ہے، دوسرے معنوں میں صرف خدا پر ایمان کافی ہے خدا کی صفات، ذات، حقیقت اس کی رضا، اس کے احکام اس کی شریعت اس کے مطالبے تقاضوں پر عمل توحید کا تقاضہ نہیں ہے بس خدا کو مان لینا ہی عہد الست کا واحد تقاضہ ہے زندگی جس طرح چاہے بسر کریں صرف خدا کے نام کی شمع دل میں روشن کرلیں وحدت ادیان کا فلسفہ یہی ہے رینے گینوں کا مکتب فکر اور بعض علماء بھی اس خیال کے حامی ہیں۔

[۱۰] **اجماع حجت نهیں هے** حالانکہ اجماع عقل کے استعمال سے پیدا ہونے والے

اختلافات کا حل بھی پیش کرتا ہے تعبیر و تشریح دین کا عمل عقل کے آلے کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے اور عقل استقراء و استخراج کے تحت غلطی کرتی ہے اور کر سکتی ہے اور کرتی رہی ہے لہٰذا اس امت میں اختلاف کا حل صرف اجماع اور مسلک جمہور ہے لہٰذا اجماع کا انکار کر کے اختلاف کا دروازہ اس طرح کھولا جاتا ہے کہ دین کے کسی حکم پر عمل ممکن ہی نہیں رہتا ہر حکم میں اختلافات نظر آتے رہتے ہیں حتی کہ انسان دین سے ہی دستبردار ہو جاتا ہے جناب جاوید غامدی صاحب کی تحریروں سے صرف ایک مثال میراث کا مسئلہ پیش خدمت ہے ۱۹۸۵ء میں میزان حصہ اول میں میراث کی آیات کا مفہوم حضرت والا نے اہل سنت کی تقلید میں بیان کیا۔سورۂ نساء میں اللہ نے ان نادانوں کو جو اپنے علم و عقل کے غرے یا ذاتی میلان کی بناء پر اس خدائی کے قانون میں ترمیم کرنا چاہیں تنبیھہ فرمائی ھے کہ یہ تقسیم (میراث) اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ھے انسان اپنی بلند پروازیوں سے اللہ کے حکم کی وسعتوں کو نہ پاسکتا ھے نہ اس کی حکمتو ں کو سمجھ سکتا ھے بندہ مومن کا کام یھی ھے کہ وہ اللّٰہ کے احکام کو سنے اور اس کے سامنے سر جھکادے کسی بات کی حکمت سمجھ میں آجائے تو اس کے حضور میں سجدہ شکر بجالائے سمجھ میں نہ آئے تو اسے اپنی عقل کے نقص پر محمول کرے احکام الٰھی کے باب میں صحیح رویہ یھی ھے. [جاوید الغامدی، میزان ۱۹۸۵، حصہ اول، ص ۵۸، طبع اول، مئی ۱۹۸۵ء]۔۲۰۰۲ء میں میزان آئی تب بھی میراث کی آیات کے مفاہیم اہل سنت کے اتباع میں تھے۔سورۂ نساء میں اللہ نے ان حصوں کو اپنی وصیت قرار دیا ھے جس کے مقابلے میں ظاہر ھے کہ کسی مسلمان کو اپنی وصیت پیش کرنے کی جسارت نھیں کرنی چاھیے نساء کی آیت ۷ کے الفاظ بھی اسی بات پر دلالت کرتے ھیں لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ھے کہ بقرہ کی اس آیت (وصیت) کا حکم منسوخ ہو گیا ھے ۔[ص ۱۶۴، میزان جاوید غامدی، طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء دارالاشراق

۱۲۳ بی ماڈل ٹاؤن لاہور، کتاب کے کل صفحات ۳۳۷ ہیں میزان طبع اول ۲۰۰۷ء، ۲۰۰۹ء،۲۰۱۰ء،۲۰۱۲ء کے ''خـاتـمہ'' میں اس کا کوئی ذکر نہیں بلکہ خاتمے میں غامدی صاحب نے لکھا ہے کہ میزان کا کام میں نے ۱۹۹۰ء بمطابق ۱۴۱۰ ہجری میں کسی وقت شروع کیا وہ آج سترہ سال بعد پایہ تکمیل کو پہنچ گیا [ص ۶۵۰، میزان، طبع پنجم ،فروری ۲۰۱۰ء] اس تحریر کے نیچے ۲۷/اپریل ۲۰۰۷ء کی تاریخ درج ہے ظاہر ہے یہ غلط بیانی ہے میزان ۱۹۸۰ء میں شروع ہوئی پہلی مرتبہ ۱۹۸۵ء میں میزان حصہ اول کے نام سے شائع ہوئی دوسری مرتبہ ۲۰۰۲ میں صرف میزان کے نام سے شائع ہوئی لیکن خاتمے میں میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے]اب کسی مرنے والے کو اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ان وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا یہ تقسیم اللہ کے علم وحکمت پر مبنی ہے انسان اس کے علم کی وسعتوں اوراس کی حکمتوں کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا وہ مومن ہے تو اس کے لیے زیبا یہی ہے کہ اس کا حکم سنے اور سر جھکا دے (میزان،۲۰۰۲ء،ص ۱۷۰ محولہ بالا) ۲۰۰۷ء،۲۰۰۸ء میں میزان جدید ضخیم آئی تو میراث میں وارث کے حق میں وصیت جائز قرار پائی لیکن نئے اجتہاد کے لیے ابتداء میں پرانی دلیلیں دی گئیں۔ سورۂ نساء میں اللہ کی طرف سے قانون نازل ہونے کے بعد اب کسی مرنے والے کو رشتہ داری کی بنیاد پر اللہ کے ٹھہرائے ہوئے وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا یہ تقسیم اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ہے اس کے ہر حکم میں گہری حکمت ہے بندہ مومن کے لیے زیبا یہی ہے کہ اس کا حکم سنے اور اس کے سامنے سر جھکا دے۔(غامدی،ص ۵۲۰،میزان،طبع پنجم،فروری ۲۰۱۰ء)

مسلمان اب رشتہ داری کی بنیاد پر اپنی کوئی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا من بعد وصیة کے جو الفاظ ان آیتوں میں بار بار آئیں گے ان سے مراد بھی ایسی ہی کوئی وصیت ہے جو وارثوں کے سوا کسی دوسرے کے حق میں ہو یا وارثوں کی کسی ضرورت کے لیے یا ان کی کسی خدمت کے صلے میں خود ان کے حق میں کی جائے۔[ص

۵۲۳،محولہ بالا]غیر مضار وصية من اللہ آیت کے آخر میں یہ الفاظ اس تنبیہ کے لیے آئے ہیں کہ وارث بنانے کا یہ عمل کسی حق دار کے لیے ضرر کا موجب نہ ہونا چاہیے اللہ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیے ہیں [ص ۵۲۸، ۵۲۹،محولہ بالا]یہ ھماشما کا مشورہ نہیں پروردگار عالم کی وصیت ھے اس کا بندہ جانتے بوجھتے کسی حق دار کو محروم کرتا ھے تو اسے معلوم ھونا چاھیے کہ اللہ اس کے ھر عمل سے باخبر ھے [ص ۵۲۹،محولہ بالا]

والدین اور اقرباء کے حصے اللّٰہ نے نساء کی ان آیتوں میں خود متعین کردیے اور انھیں اپنی وصیت قرار دیا ھے یہ حصے بالکل متعین ھیں ان میں کمی و بیشی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ھر مسلمان اب اسی قانون کے مطابق وصیت کا پابند ھے اور دستور کے مطابق وصیت کا حکم باقی نہیں رھا . [غامدی،طبع سوم،مئی ۲۰۰۸ء،میزان،ص ۵۱۹،المورد لاہور] (سورۂ نساء میں احکام میراث) اس قانون کے نازل ھوجانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو رشتہ داری کی بنیاد پر اللہ کے ٹھھرائے ھوئے وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رھا [ص ۵۲۵، محولہ بالا]پھر اجتھاد ملاحظہ کیجیے :تاھم اس کے معنیٰ یہ نہیں ھیں کہ وارثوں کی کوئی ضرورت یا ان میں سے کسی کی کوئی خدمت یا اس طرح کی کوئی دوسری چیز تقاضہ کرے تو اس صورت میں بھی ان کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی[ص ۵۲۵محولہ بالا]لیکن اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیے ہیں اس حق (وصیت کے) کو استعمال کرتے ہوئے کسی کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیے۔[ص ۵۳۱،محولہ بالا]۔

مئی ۲۰۰۸ء طبع سوم کی میزان میں غامدی صاحب کا میراث میں وصیت کے بارے میں جو

نیا موقف تھا مگر مقامات نومبر ۲۰۰۸ء طبع اول میں یہ موقف مطلق تبدیل ہو گیا۔ ۲۰۰۸ء میں میزان جدید کے بعد غامدی صاحب کی کتاب مقامات میں اجتہاد عربیت کی رو سے سامنے آیا کہ مورث کسی بھی وارث کے حق میں پوری میراث کی وصیت کرسکتا ہے۔ قرآن، عربی مبین، لغت اس معاملے میں کوئی قدغن عائد نہیں کرتے یہ قدغنیں فقہاء کی عائد کردہ ہیں۔ مقامات طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء میں ص ۱۴۰ تا ۱۴۲ ''وصیت کا حق'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں **وصیت کے لیے کوئی حد مقرر کی گئی ہے یا آدمی جس کے لیے جتنی چاہے وصیت کرسکتا ہے دوسرا یہ کہ وصیت کیا ان لوگوں کے حق میں بھی ہوسکتی ہے جنہیں اللہ نے میت کا وارث ٹھہرایا ہے** [مقامات، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۱، محولہ بالا] پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں کسی تحدید (وصیت وارث یا غیر وارث کے حق میں) کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اللہ نے علی الاطلاق فرمایا ہے کہ یہ تقسیم مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے گی زباں و بیان کے کسی قاعدے کی رو سے اس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی [ص ۱۴۱، محولہ بالا] وارثوں کے حق میں خود اللہ نے وصیت کردی ہے اللہ کی وصیت کے مقابلے میں کوئی مسلمان اپنی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا لہٰذا یہ وصیت بر بنائے رشتہ داری نہیں ہوسکتی مگر انھی وارثوں کی کوئی ضرورت کسی کی کوئی خدمت یا اسی نوعیت کی کوئی دوسری چیز تقاضہ کرے تو وصیت یقیناً ہوسکتی ہے یہ وصیت ان وارثوں کے حق میں بھی ہوسکتی ہے اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے ۔[ص ۱۴۲، محولہ بالا]۔ صرف ایک فرد ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۸ء تک یعنی صرف ۲۳ سال کے عرصے میں عربیت، عقل، منطق، استقراء کے تحت ایک ہی آیت کے کئی معانی بتا رہے ہیں سوال یہ ہے کہ میراث کے حکم پر عمل کب ہوگا؟ اجماع اور مسلک جمہور درحقیقت اسی انتشار، بدنظمی، گمراہی، پریشان خیالی سے بچانے کا دینی روحانی اسلامی اصول ہے۔

[۱۱] **دنیا و آخرت برابر ہیں** دونوں کے لیے یکساں سطح کی جدوجہد دین کو مطلوب ہے بلکہ آخرت اس دنیا کے بعد ہے لہٰذا دین پہلے ہے دنیا بعد میں یہی بات قرآن نے بیان کی ہے

کہ ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة یعنی پہلے دنیا کی فکر کرو بعد میں آخرت کی حالانکہ یہ استدلال عقلی و منطقی طور پر بھی درست نہیں کیونکہ آخرت کی جدوجہد کے لیے مہلت آخرت میں نہیں دنیا میں دی گئی ہے لہٰذا یہی دنیا دارالامتحان ہے یہ آخرت کی کھیتی ہے الدنیا مزرعة الآخرہ یہاں جو کچھ بوئیں گے وہی فصل آخرت میں کاٹیں گے۔ یہ حضرات قرآن کی اس آیت کو بھی پیش نہیں کرتے جس میں قارون سے اس عہد کے علماء کبار نے فرمایا تھا جن کے فرمان کو اللہ نے ابد تک امت کے لیے راہ عمل کے طور پر محفوظ کردیا اور جو مال اللہ نے تجھے عطا کیا ھے اس سے آخرت طلب کراور دنیا سے بھی اپنا حصہ نہ فراموش کر وَ ابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ الدنیا [۲۸:۷۷] یعنی آخرت کو اہمیت دے لیکن دنیا کو بھی قطعاً فراموش نہ کر کیونکہ یہ دنیا تیرے لیے پیدا کی گئی ہے اور تو آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے کیونکہ اللہ نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ قرآن کی آیات میں بار بار بتایا گیا ہے کہ مومن وہ ہیں جو آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے ہیں۔

[۱۲] قانون علت و معلول اہم ترین قانون ھے دنیا عالم اسباب ہے اسباب کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا یہ اصول ان جدیدیئین نے جدید سائنس سے لیا ہے حالانکہ قرآن میں حضرت ابراہیم کو بڑھاپے میں بیٹے کی بشارت، حضرت مریمؑ کو بغیر شوہر کے بیٹے کی بشارت اور حضرت زکریاؑ کو بڑھاپے میں بیٹے کی بشارت اسباب پر عدم اعتماد اور مسبب الاسباب پر مکمل اعتماد کی بشارت سنا رہے ہیں۔

[۱۳] اللہ اپنے قوانین کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا طبعی قوانین اٹل ھیں واضح رہے کہ سائنس داں بھی یہ بات نہیں کہتے ان کے یہاں سائنس کا ہر قانون، کلمہ، قاعدہ، غیر مطلق، متغیر غیر حتمی اور ہر آن بدلنے والا ہے۔ جدیدیت پسند کہتے ہیں کہ اللہ خود اپنے قانون کا پابند ہے یعنی قانون بنا کر مجبور ہوگیا ہے جس طرح اللہ نے خود اپنے لیے کتب علی رحمة رحمت کا قانون بنا کر خود کو پابند کرلیا ہے اب وہ قانون رحمت کے تحت بندوں کو سزا نہ دینے اور معاف کرنے کا پابند ہے لہٰذا اسی رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنی دوزخ کو

خود جلا کر ختم کر دے جناب غامدی صاحب نے میزان میں گمراہ فلاسفہ کے قدیم نقطہ نظر کو علامہ اقبال کے خطبات کے ذریعے پڑھ کر اپنے خطیبانہ اسلوب میں بڑے زعم کے ساتھ بیان کیا ہے واضح رہے کہ اقبال نے اس گمراہی سے رجوع کر لیا تھا غامدی صاحب قرآن کی ان تمام آیات کو بھول گئے جو دوزخ و جنت کی ابدیت اور ہمیشگی کی زندگی کا بار بار اعلان کرتی ہیں۔ کفار مغرب کو خوش کرنے کے لیے حضرت والا نے آیات قرآنی کے بغیر جہنم کو خود ہی بجھا دیا۔ توقع ہے کہ ایک دن دوزخ کی بساط لپیٹ دی جائے گی [میزان، ص ۱۹۱، فروری ۲۰۱۰ء]۔

[۱۴] **اسلام کی آمد کا مقصد تسخیر کائنات ھے** تاکہ خزائن فی الارض سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر کے اس کائنات پر خدا کی ہیبت قائم کر دی جائے جس طرح مغرب نے دنیا پر قائم کر دی ہے اس ہیبت کا حصول تسخیر ارض وسما کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا خلافت ارضی اسی کو ملے گی جو اس کام کو تکمیل تک پہنچا دے گا مغرب نے ہر کام کر لیا لہٰذا خلافت کا حق دار ٹھہرا۔ حالانکہ اسلام کی آمد کا اصل مقصد عبادت رب اور معرفت رب کے سوا کچھ نہیں کہ انسان روز حشر خدا کے سامنے کھڑے ہونے، معافی پانے اور جنت میں جانے کے قابل ہو جائے یہی فوز عظیم ہے اسی لیے فرمایا گیا کہ **انسان اور جنوں کو ھم نے صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ھے**۔ عہد حاضر میں کامیاب اور طاقت ترین ریاست وہ ہے جس کا GTA, GCI, HDI, GNI, GNP, GDP سب سے زیادہ ہو یہ اہداف تسخیر کائنات اور علوم کفار پر دسترس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہیں عہد حاضر میں یہ اہداف تمام امتوں کے مشترکہ غیر اقداری اہداف ہیں ان کا حصول تسخیر کائنات کے بغیر ممکن ہی نہیں لہٰذا تسخیر کائنات ایمان کا اولین تقاضہ ہے اس کے بغیر ریاست و خلافت اسلامیہ کا قیام ممکن نہیں شریعت کے مکمل نفاذ کے لیے اسلامی حکومت و ریاست کا قیام لازم ہے لہٰذا **تمکن فی الارض** کے لیے **تسخیر فی الارض** اور **تمتع فی الارض** بھی امر لازم ہیں، اسلام ان تصورات کو تسلیم نہیں کرتا اسلامی ریاست کے مقاصد قرآن میں متعین کر دیے گئے ہیں **نظام صلوۃ و زکوٰۃ کا قیام اور امر بالمعروف و نہی عن لمنکر**۔

[۱۵] قرآن نے حکم دیا کہ دشمن سے مقابلے کے لیے تمام وسائل جمع رکھو عہد حاضر میں تمام وسائل مغرب کے پاس ہیں لہٰذا مغرب سے وسائل اور علوم کے حصول کے بغیر غلبہ دین ممکن نہیں لہٰذا غلبہ دین کے لیے لازم ہے کہ ہم مغرب کے تمام علوم وفنون اس سے کسی نہ کسی طرح حاصل کرلیں دوسرے معنوں میں غلبۂ دین صرف علوم کفار کے اکتساب پر منحصر ہے کفار وہ علوم ہمیں نہیں دیں گے اور اگر چوری چھپے وہ علوم مل بھی گئے اور خدانخواستہ غلبہ حاصل ہوگیا تو یہ اللہ کے دین کا، اللہ کی نصرت اور اللہ کے بندوں کے ذریعے کفار پر غلبہ نہیں ہوگا بلکہ علوم کفار کے ذریعے کفار کو شکست دے کر غلبہ ہوگا یعنی کفر کی شکست کا سبب اللہ، اللہ والے، اللہ کی نصرت نہیں کفر کا علم ہی ہوگا لہٰذا برتری اصلاً علوم کفار کی قائم ہوگی، یہی علوم حجت، دلیل، قوت، برہان والحق قرار پائیں گے کیا دین کو ایسا غلبہ مطلوب ہے؟

[۱۶] **اسلامی ریاست بنیادی طور پر سوشل ویلفیئر ریاست ھوتی ھے** اس کا مقصد لوگوں کی مادی، صلاح وفلاح ہوتی ہے صحیح اسلامی ریاست قائم ہو تو ترقی اس کا لازمی نتیجہ ہے اگر مسلمان سچے ایمان کے ساتھ ترقی کریں تو مغرب کو پیچھے چھوڑ سکتے ہیں زمین کو جنت بنانا اسلامی ریاست کا اولین ہدف ہے تاکہ اس ماڈل کو دیکھ کر سب لوگ اسلام پر ایمان لے آئیں اور اس دنیا میں ہی جنت کو حاصل کرلیں اور آخرت میں بھی جنت کے حق دار بن جائیں اس تمام بحث میں یہ بات فراموش کردی گئی کہ اسلامی ریاست میں حکمراں کے خلاف خروج صرف اس وقت ہوتا ہے جب حکمراں کفر بواح کا ارتکاب کرے **استخلاف فی الارض** کا مقصد قرآن کی زبان میں **زکوٰۃ صلوٰۃ امر بالمعروف و نھی عن المنکر** کا قیام اور لوگوں کا دین میں جوق در جوق داخل ہونا **فی الدین اللّٰہ افواجاً** ہے ان مقاصد خلافت میں سوشل ویلفیئر ریاست کا کوئی ہدف موجود نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ دین کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرے جو قرآن کی اصطلاح میں اللہ کی عبادت ہے **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** [۵۱:۵۶]، **قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْن** [۳۶:۱۶] اس آگہی کے نتیجے میں انسان اپنے رب کا بندہ بن جائے **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ**

اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَ افْعَلُوا الْخَیرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ [۲۲:۷۷] بندہ رب معرفت رب کے لیے اپنا تزکیہ وتطہیر کرے ریاست وخلافت اسلامی وہ اسباب، ماحول اور روحانیت مہیا کرتی ہے جس کے باعث ہر شخص تزکیہ نفس کے قابل ہو سکے جنت انہی کے لیے جو اس دنیا میں اپنا تزکیہ کرلیں قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ...... وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ...... بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ...... وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی [۸۷:۱۴۔۱۷] تزکیہ وتطہیر نفس کرنے والا وجود ہی آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے اور دنیا کا ہر کام وہ آخرت کی بہتری کے لیے کرتا ہے کسی کام کا اصل پیمانہ آخرت ہی ہوتا ہے اسلامی ریاست عالم انسانیت تک دین کی دعوت اس طرح پہنچائے کہ ہر شخص اللہ کی جنت میں داخلے کا حق دار ہو جائے جو اتنی وسیع وعریض ہے کہ ہر انسان اس کی وسعتوں میں سما سکتا ہے۔ مدینہ کی سوشل ویلفیئر ریاست کا حال یہ تھا کہ غزوہ تبوک کے موقع پر مسلمانوں کے پاس گھوڑے اور اونٹ تک نہ تھے۔لہٰذا اسلامی ریاست کا لازماً سوشل ویلفیئر ریاست ہونا مقاصد خلافت ارضی کی نفی ہے لیکن اس کا مطلب اصول استقراء کے تحت ہرگز یہ نہیں ہے کہ اسلامی ریاست لوگوں کی خوش حالی، فارغ البالی اور مرفع الحالی کو جبراً روک دیتی ہے اوران کو فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔وہ لوگوں کو صرف یہ باور کراتی ہے کہ آخرت کو ہر صورت میں دنیا پر ترجیح حاصل ہے دنیا فانی ہے آخرت باقی ہے جو اس دنیا کو آخرت پر ترجیح دے گا وہ لازماً اپنی آخرت کا نقصان کرے گا جو آخرت کو دنیا پر ترجیح دے گا وہ لازماً اپنی دنیا کا نقصان کرے گا یہ حدیث رسالت مآب ہے۔لہٰذا جدیدیت پسندوں کی یہ کوشش کہ دنیا و آخرت برابر ہیں درست نہیں جدیدیت پسند مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کی دنیا فرعون کی طرح عالی شان ہو اور ان کی آخرت حضرت موسیٰ کی طرح شاندار ہو یہ ممکن نہیں جو فرعون جیسی مادی شاہانہ زندگی بسر کرے گا وہ فرعون کے ساتھ ہی اٹھایا جائے گا سورۂ احزاب میں آتا ہے کہ ''اک شخص کے سینے میں دو دل نہیں ہوتے''۔

[۱۷] **سائنسی علم قطعی ھے اس میں اور علم وحی میں کوئی تضاد نھیں اسلام** سائنس کا مخالف نہیں اصل معرکہ جو سو برس سے عالم اسلام کو درپیش ہے وہ یہ کہ سائنس اور

وحی کا تعلق اصول تفریق کے تحت دیکھا جائے یا اصول تطبیق کے تحت اگر اصول تطبیق کے تحت دیکھا جائے تو وحی اور سائنس میں بہ ظاہر تضاد ہو تو وحی کی ایسی تاویل کی جائے جو سائنسی حقیقت کے مطابق ہو لہٰذا دین کی تشکیل جدید عہد حاضر کا اولین تقاضہ ہے۔ ان کو یہ تک معلوم نہیں کہ سائنس کی کیا تعریف ہے سائنسی علوم کسے کہتے ہیں اور سائنٹفک میتھڈ کا اطلاق کن طریق ہائے علم پر ہوتا ہے سائنسی علم وہ ہے (۱) جس پر شک [Doubt] کیا جا سکے (۲) جس کی تردید [Falsify] کی جا سکے (۳) جس کو اسی طرح حاصل کیا جا سکے جس طرح حاصل کرنے والے نے دعویٰ کیا ہو (۴) جس کو حواس خمسہ اور تجربات کے ذریعے جانا جا سکے (۵) جس کو ریاضی کی زبان میں بیان کیا جا سکے (۶) جس میں ہر لمحے تبدیلی، تغیر، ارتقاء کا امکان تسلیم کیا جائے، (۷) جسے صرف ممکنہ سچ [Probable Truth] سمجھا جائے نہ کہ مطلق سچ [Absolute Truth]۔ (۸) سائنس اشیاء کا علم [Knowledge of things] دیتی ہے صداقتوں کا علم [Knowledge of Truth] نہیں دیتی وہ شے کے ظاہر کا علم دیتی ہے مگر شے کی حقیقت باطن کا علم نہیں دیتی حقیقت اشیاء کا ادراک سائنس کے لیے محال ہے۔ (۹) سائنس کل [Total] کا علم نہیں دیتی، صرف جزو [Part] کے ادنیٰ سے جزو کا جزوی [Partial] علم دیتی ہے ۔ وہ علم جو ان نو شرائط پر پورا اترتا ہے وہ فی الواقع سائنسی علم کہلانے کا مستحق ہے کیا وحی الٰہی اور سنتِ محبوبِ الٰہی ان نو شرائط پر پورا اترتی ہے ظاہر ہے وحی اور سنت ان شرائط پر پورا نہیں اترتی لہٰذا یہ غیر سائنسی علم ہے تو سائنس اور وحی برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟۔

[۱۸] **علم صحیح یعنی وحی الٰہی کے پرکھنے کا پیمانہ سائنس ہے لہٰذا مذاہب** عالم سے نزاع ہو یا تقابل یا مناظرہ تو قرآن کی حقانیت ادیان باطلہ پر ثابت کرنے کے لیے سائنسی علم ایجادات نظریات کو حجت، منہاج، فرقان، کسوٹی کے طور پر قبول کیا جائے کیونکہ عصر حاضر میں کفار اور مسلمانوں کے مابین سائنس کے الحق ہونے پر اشتراک ہے اختلاف نہیں اور مناظرہ کا اصول یہی ہے کہ جو اصول فریقین میں متفقہ ہے اس کے مطابق مناظرہ کیا جائے اس اصول کے اطلاق کے نتیجے میں وحی الٰہی سے برتر پیمانہ سائنس قرار پاتی ہے

جس پر قرآن کو پرکھا جائے گا حالانکہ وحی الٰہی سب سے افضل و برتر علم ہے یہ اپنے جواز کے لیے کسی دوسرے کی محتاج نہیں اس کو کسی دوسرے پیمانے پر پرکھا نہیں جاسکتا کہ یہ تمام پیمانوں کو پرکھنے کا واحد، آخری، قطعی پیمانہ ہے۔ جب سائنس کو اعلیٰ ترین علم، پیمانہ تسلیم کیا گیا اس اصول کے تحت مخلوق کو خالق اور اس کے کلام پر حاکم اور حَکَم [arbitator] بنا دیا گیا اب قرآن سائنس کی تصدیق کا محتاج ہے وہ خود حجت فرقان برہان نہیں ہے۔

[۱۹] **سائنس مذہب کے بغیر اندھا ہے اور مذہب سائنس کے بغیر لنگڑی** ۔ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں اس اصول کے تحت الدین، قرآن، اسلام کو نا مکمل، محتاج اور معذور ثابت کر دیا گیا سائنس سے متاثر بعض جدیدیت پسند مسلم مفکرین خطباء اور مناظرین نے اپنے خطبات میں اس اصول کو بار بار بیان کیا ہے۔ مذہب کو کسی سہارے کا محتاج بنانا قرآن کے اس دعوے کی نفی ہے کہ دین مکمل ہو گیا ہے اللہ کا دین ہی اگر ناقص، معذور اور کمزور ہو تو وہ حجت کیسے ہو سکتا ہے ایک مسلمان جو اپنے دین میں نقص تسلیم کرے اس کا مقام و مرتبہ کیا ہو سکتا ہے؟

[۲۰] **دنیا میں کوئی آفاقی سچ نہیں اسلام بھی کئی سچائیوں میں سے ایک سچائی ہے** لہٰذا اسلام الحق ہونے کا دعویٰ نہ کرے اس سے تصادم تنازع پیدا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ مغرب میں رواداری کا مطلب وہ نہیں ہے جو رواداری کی اسلامی اصطلاح کا مطلب ہے کیونکہ ہر اصطلاح خواہ اس میں لفظی مماثلت ہو معنویت کی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے کیوں کہ ان کا مابعد الطبیعیاتی تناظر مختلف ہوتا ہے۔ مغربی رواداری کا مطلب یہ ہے کہ مذاہب کے دعوے سائنسی بنیادوں پر نہیں پرکھے جاسکتے لہٰذا یہ علمی دعوے نہیں غیر علمی جاہلانہ دعوے ہیں لہٰذا تمام جہالتیں ایک دوسرے کو برداشت کریں کسی دعوے کو کسی دوسرے دعوے پر فوقیت نہیں دی جاسکتی دوسرے معنوں میں مذہب، دین، الحق کچھ نہیں ہوتا۔ رواداری [Tolerance] کے تحت تمام خود ساختہ سچائیوں کو یکساں درجہ دیا جائے تا کہ متنوع معاشرہ Plularstic society قائم ہو سکے جہاں آزادی اصل قدر ہو ہر شخص کو اپنا خیر خود تخلیق اور ترک کرنے کا اختیار ہو خیر اعلیٰ آزادی

ہوا ایسا معاشرہ ہو جہاں امن ہو تنازعات کا اصل سبب کسی دین کا اپنے الحق ہونے پر اصرار ہے۔ظاہر ہے یہ کاذب بیان ہے۔پہلی جنگِ عظیم سے لے کر کابل اور عراق تک پھیلی ہوئی عالمی جنگیں برپا کرنے والے مذہبی لوگ نہیں ہیں وہ مغربی ممالک، ادارے، روس، جرمنی، برطانیہ وغیرہ وغیرہ UNO اور امریکہ ہیں۔

[۲۱] **تمام اعتراضات شبہات تنقید تحقیق اسلام فقه اجتهاد قرآن پر هوتی هے** اور اس میں رخنے نظر آتے ہیں مگر کوئی ایک جدیدیت پسند مفکر مغرب پر اس طرح تنقیدی نظر نہیں ڈالتا نہ مغرب کے علوم عقلیہ کا ناقدانہ جائزہ لیتا ہے نہ مغرب میں مغرب پر ہونے والی تنقیدات [Internal Critiques] کا مطالعہ کرتا ہے نہ ہی اس کو علم ہوتا ہے کہ مغرب میں مغرب کے فلسفے جدیدیت، اس کے مظاہر سائنس ٹکنالوجی سرمایہ داری جمہوریت کے خلاف کیا لکھا جا رہا ہے ہزرل، ہائیڈیگر، رچرڈ رارٹی جیسے چوٹی کے فلسفی مغرب کے بارے میں کیا بتا رہے ہیں مغرب میں انہیں عریانی فحاشی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ان کا خیال ہے کہ مغرب عریانی فحاشی ترک کر کے اگر کلمہ پڑھ لے تو وہ ہم سے بہتر مسلمان ثابت ہوں گے لہٰذا جدیدیت پسندوں کو۔تمام خوبیاں مغرب میں نظر آتی ہیں تمام خامیاں اسلامی تاریخ اسلامی علمیت اور اسلامی شخصیات و اداروں میں نظر آتی ہیں۔

[۲۲] **قرآن سنت فقه اجتهاد کی تاریخ میں صرف عورت اور اس کے متعلقات کو زیر بحث لایا جاتا هے** کیوں کہ ان جدیدیت پسندوں کو۔اسلامی علمیت کا پندرہ سو سالہ ذخیرہ صرف عورت کے معاملے میں ناقابل قبول، قابل تنقید، ترمیم، تنسیخ، تردید نظر آتا ہے لیکن مرد کے معاملے میں یہ علمی ذخیرہ آج بھی مکمل کفایت کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنت کے احکامات پندرہ سو سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد صرف مردوں کے معاملے میں آج بھی کامل ہیں لیکن عورت کے معاملے میں ناقص ہیں اور زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا ہے عورت سے متعلق نصوص کا نقص مسلسل واضح ہو رہا ہے [نعوذ باللہ] دوسرے معنوں میں یہ نقص ذات خداوندی اور ذات رسالت مآبؐ میں تلاش کیا جا رہا ہے نعوذ باللہ۔

[۲۳] اسلام کی تباہی کا اصل سبب ملوکیت، تصوف، جامد مذہب اور سرمایہ داری تھے حالانکہ سرمایہ داری اٹھارھویں صدی میں آئی ہے یہ دولت اورسرمایہ کے فرق سے ناواقف ہیں۔ یہ ملوکیت،مشاورت، جمہوریت کے فرق سے بھی واقف نہیں انہیں تصوف کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔

[۲۴] جس طرح جدیدیت (ماڈرن ازم) تاریخ کا انکار کرتی ہے اور اٹھارہویں صدی سے پہلے کے زمانے کو یعنی مذہبی دور کو قرن مظلمہ قرار دیتی ہے مسلم جدیدیت پسند اسلامی تاریخ کا انکا رمختلف طریقوں سے کرتے ہیں اگر انکار نہیں کر سکتے تو تاریخ کو بری طرح سے مسخ کر دیتے ہیں کبھی خلافت راشدہ کو جمہوریت اوراس کے بعد خلافت کوملوکیت قرار دیتے ہیں اور پوری تاریخ اسلامی کا انکار کر دیتے ہیں دلیل یہ ہوتی ہے کہ ایک تو ہے اسلام کی تاریخ اور ایک ہے مسلمانوں کی تاریخ۔ مسلمانوں کی تاریخ باعث شرم ہے اسلام کی تاریخ عظیم الشان ہے یہ ایسی ہی دلیل ہے جس طرح ایک بچی نے اپنی ماں سے سوال کیا کہ امی میرے تو دو بھائی ہیں لیکن بھائی جان کا صرف ایک بھائی کیوں ہے؟ کیا مسلمانوں کے اعمال کے بغیر اسلامی تاریخ لکھی جاسکتی ہے؟

[۲۵] اسلامی جدیدیت پسند اپنی تحریروں میں اصطلاحات، علامات ، شخصیات تو وھی استعمال کرتے ھیں جو اسلام میں مروج ہیں لیکن ان کی ایسی توضیح تشریح توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ اصطلاح علامت اور شخصیت کا اصل مقصد کالعدم ہو جائے اور اصطلاح کا ہدف بھی حاصل نہ ہو اس طرح دینی اصطلاحات کے دائرے میں رہتے ہوئے یہ تحریف دین کا کام کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام ظاہری مماثلتوں کے باوجود اسلامی اصطلاحات اسلامی شخصیات اسلامی تاریخ اسلامی علامات سے عمومی تنفر پیدا ہو جاتا ہے۔

[۲۶] پروٹسٹنٹ ازم کی طرح یہ جدیدیت پسند قرآن کی طرف دعوت دیتے ھیں صرف قرآن سے رجوع کرنے کا صور پھونکتے ہیں قرآن کے لیے سنت کو غیرضروری سمجھتے ہیں توحید کو رسالت محمدیؐ سنت احادیث اسوۂ حسنہ سے الگ کر کے، علماء سے کاٹ

کر، دین کی روایت اور تاریخ سے جدا کر کے دین کی من پسند تشریحات پیش کرنا آسان ہوتا ہے اور جس طرح مارٹن لوتھر نے پوپ کا علماء عیسائیت کا انکار کر کے ہر فرد کو عقل، منطق ،استقراء کے ذریعے خود انجیل کو سمجھنے پر کھنے عمل کرنے کی دعوت دی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انجیل کی طرف دعوت کی تحریک آخر کار انجیل کو ترک کرنے کی دعوت بن گئی گو کہ لوتھر کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا اس نے پوپ کی حاکمیت رد کرنے کے لیے یہ طریقہ مناسب سمجھا لہٰذا جو گروہ اور فرقے قرآن کی طرف بلاتے ہیں ان کے یہاں عمل بالقرآن معطل ہو جاتا ہے صرف قرآن پر تفکر تدبر و تحقیق باقی رہ جاتا ہے باجماعت نماز کے بجائے نماز کے اوقات میں تدبر فی القرآن بغیر نماز پڑھے جاری رہتا ہے آخر کار یہ رویہ بھی ختم ہو کر بے دینی پیدا ہوتی ہے اور دینی اقدار و روایات شخصیات علامات سے کامل نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

[۲۷] **تعقل قلبی کا انکار**: جدیدیت پسند کانٹ کی طرح عقل محض کو تسلیم کرتے ہیں اور تعقل قلبی کے قائل نہیں اسلامی تاریخ میں تعقل قلبی نہایت اہم ذریعہ علم ہے عقل محض کبھی حقیقت الحقائق اور اس کی معرفت کا ادراک نہیں کر سکتی عقل کا مقام قلب ہے تعقل قلبی پر اسلامی علمیت کے ہر مکتب فکر کی تحریریں موجود ہیں **تفسیر ماتریدی** ، **ابنِ جوزی** کی ’**صید الخاطر**“ **قرطبی** کی **تفسیر قرطبی**،ابن تیمیہؒ کے **مجموع الفتاویٰ** میں تصوف اور کتاب المنطق میں تعقل قلبی پر نفیس بحث ہے امام قیمؒ کی کتاب الفوائد شیخ الاسلام خلافت عثمانیہ علامہ مصطفیٰ صابری کی **موقف العقل و العالم والعلماء** ،وغیرہ میں تعقل قلبی پر نفیس استدلال کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ بے شمار فقہاء علماء کی کتابوں میں تعقل قلبی مرکزی مضمون ہے۔

[۲۸] **مسلم قوم پرستی اور قومی ریاست کا جواز قرآن و سنت سے نکالتے ہیں** جبکہ دارالاسلام قومی ریاست نہیں آفاقی ریاست ہوتا ہے مسلم قوم پرستی اسلام کی آفاقیت کی نفی ہے یہ عصبیت اور قوم پرستی ہے جو اسلام کی ضد ہے کسی مذہبی قومی ریاست کا سربراہ اس مذہب کا ماننے والا غیر ملکی نہیں ہو سکتا خواہ وہ علم و تقویٰ میں سب سے فائق تر ہو قوم پرستی کی بنیاد دوسری قوموں اور ہم مذہب قوموں سے نفرت اور امتیاز پر ہوتی ہے تبھی

ایک مسلم قوم دوسری مسلم قوم کے فرد کو اپنی قومیت نہیں دیتی۔

[۲۹] **اسلام جهاد و اجتهاد سے پهیلا هے اور اجتهاد سے مراد هے ایجادات تخلیقات و اکتشافات کرنا** جہاد آلات کے ایجاد کرنے سے مشروط ہے لہٰذا علم حرب و ضرب کا حصول اصل اجتہاد ہے جس سے جہاد ممکن ہوتا ہے اجتہاد کی جدید تعبیر اسلامی علمیت کے لیے نا قابل قبول ہے۔

[۳۰] **سورة علق وغیره میں علم سے مراد نیچرل سائنس کے علوم هیں** اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعے نیچرل سائنس کا علم انسانوں کو سکھایا علماء سے مراد سائنس داں ہیں سورہ فاطر میں علماء کے ذکر سے پہلے کائناتی علوم کا ذکر ہے طبیعیاتی و تکوینی علوم کے ذکر سے مراد نیچرل سائنس کے ماہرین کو العلماء کہا گیا ہے نہ کہ علوم شریعہ کے ماہرین ہیں جن کو علماء قرار دیا گیا ہے وہ مقامات جہاں آ ثار کائنات آیات کائنات کا ذکر ہے ان کا حقیق فہم نیچرل سائنسز کے علوم کے بغیر ممکن ہی نہیں، اس استدلال کا نتیجہ یہ ہے کہ قرن اول خیر القرون کا فہم قرآن امت کے لیے معتبر نہیں رہتا کیونکہ وہ نفوس تو ان جدید سائنسی علوم سے قطعاً ناواقف تھے لہٰذا قرآن کے مخفی اسرار سے بھی لاعلم رہے لہٰذا علمی اعتبار سے عہد حاضر کے مسلمانوں کو صحابہ کرام پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔

[۳۱] جدیدیت پسند مفکرین احکامات کو اخذ کرتے ہوئے دین کی کلیت (Totality) اس کے اصل سانچے ڈھانچے [Matrix] اس کی جامعیت ، ماہیت ،نوعیت، حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ سائنسی علم کی طرح دین کے احکامات کو اجزاء میں تقسیم کر کے کلیات کے بجائے جزئیات کی بنیاد پر استنباط کرتے ہیں جس کے باعث حکم کی اصل روح فنا ہو جاتی ہے اور دین کے نام پر ہی دین سے انحراف کا راستہ کھلتا ہے اس طریقے سے فقہ، اجتہاد، فتویٰ، تجدید دین کے بجائے تجدد کا ذریعہ بن جاتے ہیں لہٰذا مجتہدین کے بجائے متجددین پیدا ہوتے ہیں۔

امام غزالی کے الفاظ میں اس طریقے (جزئیات سے کلیات اخذ کرنے کا اصول) کو اختیار کرنے کے نتیجے میں فقہ کا علم بھی علم آخرت نہیں علم دنیا بن جاتا ہے اور اس علم سے تقویٰ کے

بجائے دنیا پرستی کا فروغ ممکن ہو جاتا ہے ہر فتوے، اجتہاد کا مقصد ہر طرح کے حالات، اور ہر زمانے میں خوف خدا پر یقینی زندگی کو ممکن بنانا ہے۔ اجتہاد کا مقصد رہتی دنیا تک صبح محشر تک قرآن وسنت اور روایات سلف کی تقلید کو ہر عہد میں ممکن بناتے رہنا ہے تاکہ مسلمان روز حشر اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے معافی پانے اور جنت کے انعام کا مستحق ہونے کے قابل ہو سکے کلیت کو نظر انداز کرنے کے باعث ہی بہت سے مستشرقین اور جدیدیئین کو اسلام کا قانون طلاق شرمناک عمل نظر آتا ہے کہ مسلمان جب چاہے ایک ساتھ یا تین طہر میں طلاق دے کر عورت کو الگ کر دیتا ہے اور اسے کوئی سزا نہیں ملتی لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ طلاق کے اس قدر سادہ، آسان، قانون کے باوجود مسلمانوں میں طلاق کی شرح دنیا میں سب سے کم کیوں ہے اور مغرب میں طلاق کے سخت ترین قوانین کے باوجود طلاق، زنا کاری اور جنسی جرائم کی شرح دنیا بھر میں سب سے زیادہ کیوں ہے اس حقیقت کے باجود کہ وہاں طلاق کے سخت قوانین کے باعث نکاح کی شرح بھی دنیا بھر سے کم ہے ظاہر ہے طلاق کے قانون کو اسلامی علمیت کی کلیت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو تجدد پسندانہ افکار ہی جنم لیں گے ۔طلاق کا قانون اسلامی علمیت، سنت، انفرادیت، معاشرت، روحانیت، تاریخ کے تعامل سے روبہ عمل آتا ہے نکاح رسول کی سنت ہے جو اسے اختیار نہ کرے وہ مجھؐ سے نہیں فلیس منی ۔طلاق اللہ کو ناپسندیدہ کاموں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ کام ہے اس کلیت کو نظر انداز کر کے قانون طلاق سمجھا ہی نہیں جا سکتا اس کی مثال H2O اور NACL پانی اور نمک ہے ہائیڈروجن آگ لگانے والی خشک گیس ہے لیکن جب یہ آکسیجن کے ساتھ تعامل کرتی ہے تو پانی بناتی ہے اور اپنی صفت تبدیل کر لیتی ہے پانی آگ بجھانے کے کام آتا ہے سوڈیم کلورائیڈ نمک میں کلورین زہر ہے اگر کوئی اسے کھا لے تو مر جائے لیکن جب کلورین سوڈیم کے ساتھ تعامل کرتا ہے تو اس کا زہریلا اثر ختم ہو جاتا ہے یہ نمک بن جاتا ہے گلاب کے پھول کو اجزاء میں تقسیم کر کے دیکھا جائے تو اس کا کوئی اثر ہمارے ذہن وقلب پر قائم نہیں ہوگا لیکن مکمل گلاب اپنی کلیت [Totality] میں ہمیں تازگی، شگفتگی ،راحت، رعنائی، زیبائی مہیا کرتا ہے طلاق کے قانون کو جب گلاب کے پھول کی طرح دیکھا جائے

تو وہ کچھ اور ہے اور جب اسے توڑ کر پتیوں، ڈنٹھل، کانٹوں، زردانوں کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے تو اس کا نتیجہ اور اثر کچھ اور ہوگا ۔

[۳۲] **قرآنی اصطلاح العلم کا مطلب سائنسی علم ھے** قرآن سائنس ہے اور سائنس قرآن۔قرآن کی اصطلاح عالم کا مطلب سائنس داں ہے جو فطرت، قدرت ،آثار کائنات کا قریب ترین مشاہدہ کرتا ہے جو قرآن کو مطلوب رویہ ہے تفکر تدبر کی قرآنی اصطلاحات کا اصل عامل سائنس داں ہی ہوتا ہے۔قرآن کی پہلی سورۃ العلق میں قلم اور علم کا ذکر کیا گیا ہے وہاں علم سے مراد تمام علوم عقلیہ خصوصاً سائنسی علوم ہیں جن سے مسلمانوں کو قوت حاصل ہوتی ہے لہٰذا ان علوم کا حصول فرض کفایہ نہیں فرض عین ہے کیونکہ علوم عقلیہ ہی اصل العلوم ہیں قرآن کی تمام آیت انہی علوم کے حصول کی دعوت دے رہی ہیں اور مسلمان کئی صدیوں سے اس آواز کو نظر انداز کر رہے ہیں۔اس موقف کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم سے اچھے تو کفار ہیں جو قرآن کی ایک آیت پڑھے بغیر ہی تمام علوم عقلیہ کے ماہر ہو گئے قرآن کے سب سے زیادہ جاننے والے اس کا حقیقی فہم حاصل کرنے والے صحابہ کرام تھے مگر ان میں ایک بھی سائنس داں نہیں تھا اور کسی ایک صحابی نے کوئی کتاب نہیں لکھی نہ کوئی شے ایجاد کی نہ کوئی سائنسی نظریہ، مساوات تخلیق کی تو کیا وہ فہم قرآن سے واقف نہ تھے؟۔

[۳۳] **اس امت کے زوال کا اصل سبب علوم عقلیہ کا زوال ھے** مسلمان دنیا کی امامت سے اس لیے ہٹا دیے گئے کہ وہ اس دنیا کو تسخیر کر کے عقلی علوم کی میراث سے دستبردار ہو گئے یہ علوم مسلمانوں کے ذریعے یوروپ منتقل ہو گئے انھوں نے ہماری اس میراث دینی کو سینے سے لگایا اس میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور ہم پر غالب ہو گئے لہٰذا غلبۂ دین کی حکمت عملی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک زوال کے اسباب کا صحیح تجزیہ نہ ہو تبھی ہم حالت کمال کی طرف لوٹ سکتے ہیں لہٰذا زوال کی رات اسی وقت ڈھلے گی جب امت علوم عقلیہ پر دسترس حاصل کر کے کفار کو ان علوم میں شکست سے ہمکنار کر دے گی ۔ یہ تجزیہ ہی غلط ہے اگر علوم عقلیہ میں برتری کامیابی کا زینہ ہے تو عباسیوں کو تاتاریوں نے ،عیسائیوں نے اندلس میں مسلمانوں کو اور انگریزوں نے ہندوستانی مسلم حکمرانوں کو کیوں شکست دے دی

جبکہ مسلمان مادی طور پر ہر لحاظ سے بہتر اور برتر یا کم از کم برابر تھے۔

[۳۴] **تفردات اور شدوذ سے کلیات اخذ کرنا** جدیدیت پسند امت کی تاریخ پڑھ کر مختلف شخصیات کے تفردات علمی کو جمع کر لیتے ہیں اور ان تفردات سے نئی علمیت وضع کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ مسلمہ اسلامی روایت اور علمیت کے متبادل علمیت تخلیق کی جائے اور امت کی تاریخ، اجماع، روایت، تعامل اور تسلسل کو نظر انداز کر کے ہر شخص کو اجتہاد کامل کی آزادی دے دی جائے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جدیدیت پسند اجماع کو حجت نہیں مانتے لیکن کسی کے تفرد کو مان کر اسے حجت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ تفرد کو حجت تسلیم کر رہے ہیں جب اجماع حجت نہیں ہے تو تفرد کیسے حجت ہوسکتا ہے اکثر جدیدیت پسند مسلم مفکرین کے تفردات کی دلیل ی ہوتی ہے کہ ماضی میں فلاں فلاں ہسی اس رائے کی حامل رہی ہے لہٰذا تمام تفردات جمع کر کے یہ فلسفے کی زبان میں فلسفہ اسطفطائیت کے مکتب میں شامل ہو جاتے ہیں جو کم زور ترین فلسفہ تصور کیا جاتا ہے۔

[۳۵] **عقل مستقل پیغمبر ھے** یران، ہندوستان میں بعض ایسے جدیدت پسند مفکرین بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ عقل اور رسول دونوں اللہ کے پیغمبر ہیں ایک مستقل ایک عارضی۔ عقل و نقل میں اصلاً کوئی تضاد نہیں اگر کبھی ان میں تعارض پیدا ہو جائے تو نقل کے مقابلے میں عقل کو فوقیت حاصل ہوگی کیونکہ نقل کو ہم عقل سے سمجھتے ہیں لہٰذا عقل نقل کے مقابلے میں فائق ہے کیونکہ عقل پیغمبر حاضر ہے اور جب پیغمبر باطن موجود ہے تو وہی آخری فیصلہ کن عامل ہے پیغمبر ظاہر کی کیا ضرورت؟ ورنہ مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ پیغمبر حاضر عقل قیامت تک موجود ہے پیغمبر ظاہر اب موجود نہیں نہ کبھی آئے گا بہر حال حاضر غائب سے بہتر ہے اس نظریے کی زندیقی کسی دلیل کی محتاج نہیں۔

[۳۶] (ا) **رسالت مآب کے قول اور صحابہ کے کسی خاص عمل، فیصلے، تعامل یا اجتہاد کی عصر حاضر میں تعمیم کرنا یا تخصیص کر دینا** ۔ مثلاً مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکالنے کا حکم اس زمانے کے لیے خاص تھا اس عہد کے مشرکین و اہل کتاب کے لیے تھا وہ باقی نہیں رہے لہٰذا حکم اب باقی نہیں رسول کے ساتھ ختم

ہو گیا اس میں قیامت تک توسیع ممکن نہیں۔ رسول اللہ نے قانون اتمام حجت کے تحت کفار و اہل کتاب پر تلواروں کے ذریعے عذاب نازل کیا مگر صحابہ نے روم و ایران پر یہ عذاب کیوں نازل کیا تو جواب ملے گا کہ رسول اللہ انھیں خط لکھ چکے تھے خط اتمام حجت تھا لہٰذا صحابہ کا جہاد صرف اس عہد کے لیے خاص تھا اب نہ رسول ہیں نہ صحابہ لہٰذا اقدامی جہاد دین کی دعوت کے لیے قیامت تک ممنوع ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا تو اس کی تصریح کی جائے گی کہ کافر سے مراد عہد رسول کے کفار و اہل کتاب و مشرکین تھے لیکن وہ باقی نہ رہے لہٰذا یہ حکم بھی اب باقی نہیں ہے اب کافر مسلمان ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں۔ (ب) کسی خاص اجتہاد کو اجتہاد کے بجائے تفرد قرار دینا اور اس اجتہاد کی تاریخ تناظر کو دانستہ نظر انداز کر کے اس اجتہاد کی تعمیم کرنا اور اس کا اطلاق عہد حاضر میں اس طرح کرنا کہ اسے مغربی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے مثلاً حضرت عمرؓ نے ایک عورت کو اسلام قبول کر لینے کے باوجود اپنے غیر مسلم شوہر کے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔ اس اجتہاد کی بنیاد پر مغرب میں آباد تمام ان عورتوں کو جو مسلمان ہو چکی ہیں اور اپنے شوہروں سے ترک تعلق چاہتی ہیں ان کافر شوہروں کے ساتھ رہنے کی مکمل آزادی مہیا کرنا اور اس آزادی کے لیے شرعی دلائل دینا تا کہ متنوع معاشرے Pluralistic Society کی مغربی کافرانہ اصطلاح کے مطابق شریعت سے آزاد معاشرہ اور معاشرت تخلیق و منظّم کی جا سکے یہ اجتہاد کرتے ہوئے جدیدیئین اس بات کا ذکر نہیں کرتے کہ اس وقت خلافت راشدہ موجود تھی خلافت راشدہ میں پبلک لاء اسلامی تھا مسلمان دنیا کی امامت کر رہے تھے کفر کے بڑھنے پھلنے پھولنے کے کوئی امکانات نہ تھے اہل کتاب جزیہ دے کر اور ذمی بن کر ریاست اسلامی میں رہ رہے تھے کسی خاص صورت میں حضرت عمرؓ نے اس کی اجازت دی جس پر کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا اس کے بعد اسلامی خلافت میں اس اجتہاد کا کبھی اعادہ نہیں کیا گیا اس تمام تناظر، پس منظر، پیش منظر اور تہہ منظر کو دانستہ نظر انداز کرنا در اصل مغرب کو مطلوب اجتہاد کی دانستہ کوشش ہے۔ جدیدیئین اجتہاد اور تفرد میں فرق کرنے سے قاصر ہیں بہت سے معاملات میں ایک بڑا عالم اپنی رائے مختلف رکھتا ہے لیکن عمل اس

رائے پر کرتا ہے جس پر امت کا اجماع ہو علم و عمل کے اس فرق کو جدیدیت پسند دانستہ نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ حدیث کے کسی راوی کا عمل اگر اس کی روایت کے خلاف ہے تو راوی کا عمل حجت ہوتا ہے اس کی روایت حجت نہیں ہو سکتی۔ مگر جدیدیت پسند راوی کے عمل کو نظر انداز کر کے روایت پر اصرار کریں گے۔

[۳۷] **زمانے کی بڑی تبدیلیوں کو سامنے رکھنا قرآن فھمی کے لیے ضروری ھے** یعنی فہم قرآن منحصر ہے تبدیلیٔ زمانہ پر جیسے جیسے زمانہ بدلے گا قرآن کا فہم بھی سورج کی طرح اپنا رخ بدلتا جائے گا۔

[۳۸] **فقہ کے بہت سے اصول اور مسلمہ فیصلے جن کو اجماع کا درجہ حاصل ھے** قرآن وسنت کے منافی ہیں جیسے مسلمان عورت کا کتابی مرد سے نکاح کا حرام ہونا قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی جھگڑے چل رہے تھے تب مسلمان عورت کی غیر مسلم مرد سے شادی فقہاء کی جانب سے ممنوع قرار دی گئی تھی اب وہ جھگڑے ختم ہو گئے ہیں لہٰذا کفار سے نکاح جائز ہے۔

[۳۹] **ھر نبی کی شریعت انسانی تمدن میں ارتقاء اورتغیر کے باعث البتہ بہت کچھ مختلف رہی اور تمدن کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر رہی** ۔جب ذہن انسانی کا ارتقاء مکمل ہو گیا تو شریعت بھی مکمل کر دی گئی جس میں قیامت تک تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ دوسرے معنوں میں زمانے بدلنے کے ساتھ شریعت بھی بدلتی رہی اللہ تعالیٰ کو معلوم نہ تھا کہ مستقبل میں زمانہ کیسے بدلے گا شریعت میں کیا قابل تغیر تھا کیا مستقل تھا اس کا ادراک بھی ان جدیدیئین کو حاصل نہیں مثلاً سورۂ نساء میں معاشرتی احکامات کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ معاشرتی احکامات تمام امتوں میں متفق علیہ رہے ہیں **وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ لَقَدۡ وَصَّیۡنَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ اِیَّاکُمۡ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ وَ اِنۡ تَکۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ کَانَ اللّٰہُ غَنِیًّا حَمِیۡدًا...... وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا...... اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ اَیُّہَا النَّاسُ وَ یَاۡتِ بِاٰخَرِیۡنَ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی ذٰلِکَ**

قَدِيْرًا [۴:۱۳۱،۱۳۲،۱۳۳]۔ جب دلیل یہ ہو کہ شریعت ذہن انسانی کے ارتقاء کے باعث ارتقاء پذیر رہی تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ رسالت مآب سے پہلے آنے والے انسانوں اور انبیاء کا ذہنی ارتقاء بھی مکمل نہیں ہوا تھا یہ تنقیص رسالت ہے ارسطو اور کانٹ انسانی ذہن کو چودہ زمروں [Categories] میں منقسم سمجھتے ہیں اور ہر انسان کو اسی بنیاد پر عاقل تصور کرتے ہیں ہیگل نے اس تقسیم سے اختلاف کیا اور ان زمروں کی تعداد ۱۰۸ تک کر دی مغرب میں تمام انسان اسی لیے برابر ہیں کہ سب عقل رکھتے ہیں۔ سابقہ شریعتوں میں کیا قابل تغیر تھا اس کا تعین فی الحال ممکن نہیں لہٰذا اس بارے میں خامشی کے بجائے بیان بازی غیر علمی رویہ ہے۔

[۴۰] **محسوس سے غیر محسوس کا استنباط یعنی وجود کائنات سے خالق کائنات کے وجود کی شہادت [Design argument]** وجود خداوندی کی دلیل قطعی ہے اور حجت ہے۔ خدا کا وجود دلیل عقلی سے ثابت شدہ ہے قدیم عقلی دلائل آج بھی کارآمد ہیں جبکہ یہ بات درست نہیں کانٹ نے تنقید عقل محض Critique on pure reason میں وجود خداوندی کے تمام عقلی دلائل کو عقل سے رد کر دیا واجب الوجود کے بارے میں یہ سوال اٹھا کہ اگر اللہ کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا کائنات اس نے پیدا کی محرک اول کے بغیر کائنات وجود میں نہیں آ سکتی تو خود محرک اول واجب الوجود کو کس نے پیدا کیا؟ رسالت مآبؐ نے پندرہ سو سال پہلے ایک صحابی کے سوالات کے جواب میں یہی فرمایا تھا کہ عقلی دلائل کی کوئی حد نہیں ہے اگر تم کہو گے کہ خدا نے یہ کائنات پیدا کی ہے تو وہ اگلا سوال پوچھے گا کہ خود خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ کیونکہ ہر سبب کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا کانٹ نے فلسفے کی ہزاروں سال کی تاریخ میں وجود خدا پر دی گئی عقلی دلیلوں کو اسی بنیاد پر رد کیا کہ اگر اللہ ہر تخلیق کا سبب ہے تو خود خدا کو کس نے خلق کیا؟ رسالت مآبؐ نے اس سوال کے امکان کی جانب کانٹ سے بہت پہلے اشارہ کر دیا تھا کائنات کا وجود اگر بتا رہا ہے کہ کوئی خالق ہوگا جیسے گھڑی کا وجود گھڑی ساز کو واجب الوجود قرار دے گا جس سے انکار ممکن نہیں لیکن کسی خالق کے تصور سے یہ تصور کیسے لازم ہو گیا کہ وہ خالق اب زندہ بھی ہے

اور اگر زندہ ہے تو اب بھی کارآمد ہے وغیرہ وغیرہ۔ برٹینڈ رسل نے اپنے مضمون Why I am not chiristian میں کانٹ کے تمام دلائل کو اختصار سے پیش کر دیا ہے خود کانٹ نے ایک طرف وجود خداوندی کے حق میں دیے گئے تمام دلائل کو رد کر دیا مگر وجود خداوندی کے حق میں ایک نئی اور منطقی وعقلی دلیل دی اس دلیل کو رسل نے کانٹ کے بتائے ہوئے منہاج عقلی کے ذریعے رد کر دیا۔ اس کی تفصیل بھی اسی مضمون میں درج ہے۔ [جاری ھے]

[۴۱] **رسول اللہ کو قرآن کی کسی آیت کی تخصیص و تعمیم کا اختیار نہیں**

کیوں کہ قرآن حجت اور قطعی الدلالۃ ہے اسے کسی خارجی تشریح توضیح توجیہہ کی ضرورت نہیں قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی نہیں ہے خدا کا پیغمبر بھی اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم وتغیر نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے جو کہنا چاہتا ہے پوری قطعیت سے کہتا ہے کسی معاملے میں اپنا مدعا بیان کرنے سے عاجز قاصر وخاسر نہیں اس کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں وہ نہ اس سے مختلف ہے نہ متبائن اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کرتا ہے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال اگر پیدا ہو جائے کہ اس کے الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو قرآن کی ہر چیز بالکل بے معنی ہو جائے گی قرآن کے مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی **القرآن لا یحتمل الا تاویلا واحدا** کہ قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز گنجائش نہیں ہوتی قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے انسان مجبور ہے کہ بس وہ ایک ہی قول کو اختیار کرے ورنہ قرآن چیستاں بن کر رہ جائے گا۔

برعظیم پاک و ہند میں قرآن سے متعلق ان اصولوں کا اعلان احمد دین امرتسری، فراہی صاحب، پرویز صاحب، امین احسن اصلاحی صاحب اور جاوید غامدی صاحب نے کیا ہے لیکن اس دعوے کے باوجود امرتسری صاحب اور پرویز صاحب نے قرآن کی ایک ہی آیت کے ایک سے زیادہ معانی بیان کیے ہیں فراہی مکتب فکر کے تین اہم افراد فراہی صاحب،

اصلاحی اور غامدی صاحب نے آیۂ حجاب سے متعلق آیات کے جو مفاہیم معانی مطالب بیان کیے ہیں وہ بالکل متضاد ہیں مکتب ایک، اصول ایک اور نتائج بالکل مختلف [تفصیلات کے لیے مجموعہ تفسیر فراہی، تدبر قرآن، مسلمان عورت دوراہے پر اور غامدی صاحب کی کتاب میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء میزان طبع دوم ۲۰۰۲ء، میزان طبع اول ۲۰۰۸ء، میزان طبع پنجم ۲۰۱۰ء میزان طبع ششم ۲۰۱۲ء، اسلام کیا ہے طبع اول تا طبع پنجم، اشراق کی فائلیں، قانون اور معاشرت پر ۱۹۹۱، سے ۱۹۹۵ء تک شائع ہونے والے کتابچے، میزان ۲۰۰۸ء، ملاحظہ کیجیے] جناب غامدی صاحب نے ۳۵ سال کے عرصے میں آیۂ حجاب کے چھ سے زیادہ مطالب بیان کیے ہیں اور ہر نیا فہم سابقہ فہم کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔قرآن کے قانون میراث کی آیات کے غامدی صاحب نے ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۰۰۸ء تک تین مختلف مفہوم پیش کیے جبکہ ان کے اصول کے مطابق بھی قرآن کی آیت کا ایک ہی مطالب ہوسکتا ہے ورنہ قرآن چیستان بن جائے گا [تفصیلات کے لیے میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء، میزان ۲۰۰۲، میزان ۲۰۰۸ء، مقامات طبع دوم جولائی ۲۰۰۶ء اور مقامات طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء ملاحظہ کیجیے]

قرآن میں عورت کے نشوز پر مرد کو سزا دینے کی ہدایت دی گئی ہے (النساء:۳۴) اس آیت میں اجازت و ہدایت مرد کو دی گئی ہے اور قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے امت کا اجماع بھی یہی ہے اہل قرآن کی طرح غامدی صاحب جو پیغمبر کو بھی قرآن کی کسی آیت کی تخصیص تعیم یا ترمیم تفسیر وتوضیح وتشریح کا اختیار نہیں دیتے خود اس آیت کی تعیم وتخصیص و ترمیم وتصحیح کا اختیار اپنے لیے حاصل کر لیتے ہیں۔ میزان طبع اول ۲۰۰۸ء اور طبع پنجم ۲۰۱۰ء میں لکھتے ہیں عورت کو جسمانی سزا دی جائے ظاہر ہے یہ سزا اتنی ہی ہوسکتی ہے جتنی کوئی معلم اپنے زیر تربیت شاگردوں کو یا کوئی باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے نبیؐ نے اس کی حد ''غیر مبرح'' کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے یعنی ایسی سزا نہ دی جائے جو کوئی پائیدار اثر چھوڑے مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے (ص ۴۲۱،۴۲۲) غامدی صاحب نے میزان ۲۰۱۰ء میں لکھا ہے کہ خدا کا پیغمبر بھی اس کے حکم کی تحدید و تخصیص اور ترمیم وتغیر نہیں کرسکتا

(ص ۲۵، میزان ۲۰۱۰ء) لیکن یہاں پیغمبر کی تحدید و تخصیص خود بیان کر رہے ہیں جو ان کے طے کردہ اصول و مبادی کی نفی ہے پیغمبر کو اپنے اصول کی نفی کی اجازت دینے کے بعد نفی کا یہ اختیار وہ اپنے لیے بھی حاصل کر لیتے ہیں اور قرآن کی اس ہدایت یا اجازت کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا خطرہ ہو انھیں نصیحت کرو ان کے بستروں میں انہیں تنہا چھوڑ دو اور اس پر بھی نہ مانیں تو انہیں سزا دو پھر اگر وہ اطاعت کریں تو ان پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ [النساء: ۳۴] جس میں تمام تر خطاب مرد سے ہے خاندانی مسئلے سے ہے نجی معاملہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے گھر میں حل کرنے کا طریقہ بتا رہے ہیں اور اسے عدالتوں میں گھسیٹنے اور عوامی گفتگو سے بچانے کے لیے اس کا ایک اندرونی حل پیش فرما رہے ہیں مگر غامدی صاحب اس حکم کی تخصیص و توسیع و تعمیم و تشریح کرتے ہوئے اپنے اصول ارتقاء کے تحت عورت کو تادیب کے خدائی حکم کا ارتقاء کے تحت نیا مطلب بتاتے ہوئے مقامات طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء میں لکھتے ہیں تمدن کی تبدیلی سے عورت کو سزا کا حق عدالت کو دیا جا سکتا ہے یہ محض طریقہ کار کی تبدیلی ہے اس سے کوئی حکم معطل نہیں ہوتا سزا شوہر دے یا بزرگ دے یا عدالت دے اس سے حکم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی [ص ۱۴۷، ۱۴۶] قرآن نے صرف شوہر کو تادیب کرنے اور الزام تراشی سے بچنے کی ہدایت کی تھی مگر غامدی صاحب نے پہلے میزان ۲۰۱۰ء میں تادیب کے حکم کو شاگرد اور اولاد کو سزا دینے کے عمل پر قیاس کر کے اس حکم کی تحدید و تخصیص کی کہ شوہر بیوی کو شاگرد سمجھے یا اولاد اور انہی پر قیاس کر کے بیوی کو سزا دے۔ جبکہ بیوی نہ شاگرد ہے نہ اولاد کیونکہ شاگرد اور اولاد سے نہ نکاح ہو سکتا نہ طلاق دی جا سکتی ہے نہ ہم بستری ہو سکتی ہے قرآن نے شوہر کو مخاطب کیا ہے غامدی صاحب نے اس حکم کی تعمیم اور حکم میں توسیع کرتے ہوئے شوہر۔ خاندان کے بزرگ اور عدالت کے جج کو یکساں مرتبہ دے دیا سرکش عورت کے لیے شوہر کے جو جذبات ہوں گے کیا وہی جذبات کسی بزرگ، اور عدالت کے کسی جج کے ہو سکتے ہیں بزرگ کی صحت اگر سزا دینے کے قابل نہ ہو تب اگر وہ بہت کم زور بزرگ ہوں تب؟ عدالت مرد کی ہوگی یا عورت کی ہوگی؟ سزا جج دے گا یا اس کے لیے جلاد کا تقرر کرے گا جلاد مرد ہوگا یا عورت ہوگی؟ اگر مرد ہوگا تو محرم ہوگا یا

نا محرم ہوگا؟ اگر نا محرم ہوگا تو نا محرم عورت کو ہاتھ کیسے لگا سکتا ہے؟ اگر عورت جسمانی سزا دے گی تو عورت مرد کے مقابلے میں جسمانی طور پر کم زور ہوتی ہے اور عورت ذات ہونے کے باعث وہ سزا دے گی تو اس میں وہ جوش اور شدت بھی نہیں ہوگی جو شوہر میں ہوگی؟ تو کیا اس سے سزا کا مقصد حاصل ہو جائے گا؟ اگر عدالت کا مرد جج سزا دے گا تو وہ بھی عورت کو شرعاً اپنے ہاتھ سے سزا نہیں دے سکتا آخری چارۂ کار یہ ہے کہ عدالت شوہر سے عورت کو اپنی نگرانی میں سزا دلوا دے اگر یہی کرنا ہے تو غامدی صاحب کو اتنے اجتہادات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سورۂ مائدہ میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم آیا ہے مگر کون سا ہاتھ کاٹا جائے اس کا حکم موجود نہیں ہے مگر سنت حدیث و اجماع کی روشنی میں دایاں ہاتھ پہنچے سے کاٹا جاتا ہے غامدی صاحب کے اصول و مبادی کے تحت یہ غلط ہے مگر خود غامدی صاحب اسی غلط کی تقلید بھی کر لیتے ہیں۔

[۴۲] جمہوریت کی روح قرآن میں ہے۔

[۴۳] **اسلامی علمیت کے ماخذات سے حوالے دیتے ہوئے اصل مصادر کو نہ دیکھنا** ۔اصل مصادر کے بجائے ثانوی مصادر سے حوالے اخذ کرنا لیکن اس ثانوی ماخذ کا حوالہ نہ دینا بلکہ حوالے میں اصل ماخذ کا حوالہ دینا۔اصل حوالے میں ترمیم، تصحیح، تحریف کر کے اس سے اپنے مطالب و مفاہیم اخذ کرنا۔ علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور جاوید احمد غامدی صاحب اور دیگر بے شمار جدیدیت پسند مفکرین نے یہ کام نہایت ہمت کے ساتھ کیا ہے۔شبلی نعمانی نے الکلام میں شرعی سزاؤں کی ابدیت کو غیر ابدی ثابت کرنے کے لیے شاہ ولی اللہؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا حوالہ تحریف، ترمیم و اضافہ کر کے پیش کیا اور شاہ صاحب کی عبارت کو اس طرح مسخ کر دیا جس کے نتیجے میں شاہ صاحب کی تحریر سے حدود و تعزیرات کی ابدیت کی مکمل نفی ہوگئی شبلی نعمانی کی اس گمراہی و گستاخی کی تفصیل جناب سہیل عمر نے اپنی کتاب ''خطبات اقبال نئے تناظر میں'' کے ضمیمے سزا و نا سزا میں بیان کی ہے یہ کتاب اقبال اکادمی لاہور نے شائع کی ہے سہیل عمر لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے ''خطبات'' میں اجتہاد والے خطبے میں اسلامی حدود و تعزیرات کو متغیر تسلیم کرتے ہوئے اس کے مطلق ابدی ہونے کا

انکار کیا اور اپنے دعوے کے حق میں شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ البالغہ کا حوالہ دیا لیکن سہیل عمر نے جب شاہ صاحب کی کتاب سے اصل حوالہ تلاش کیا تو وہاں وہ حوالہ موجود نہ تھا اقبال نے اس حوالے کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے اصل کتاب کے صفحات نمبر بھی درج کر دیے سہیل عمر نے جب اقبال کے حوالے اور شبلی کے الکلام میں شاہ صاحب کے حوالے کا تقابل کیا تو معلوم ہوا کہ اقبال نے شاہ ولی اللہ کی اصل کتاب نہیں دیکھی بلکہ شبلی پر اعتبار کرتے ہوئے شبلی کی الکلام سے شاہ ولی اللہ کا حوالہ انگریزی میں ترجمہ کر کے یہ تاثر دیا کہ انہوں نے اصل کتاب دیکھی ہے (اقبال نے بعد میں خطبات کے تمام مباحث سے رجوع کر لیا تھا تفصیلات کے لیے امالی غلام محمد کا مطالعہ کیجیے جریدہ ۳۴ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی)

شبلی نے تاریخ اسلام و فقہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کہ مسلمان جس قوم کی حکومت میں ہوں اس کے اصلی وفادار ہوں ''محکومیت مسلمان کی شرعی حیثیت'' پر شبلی نعمانی کے مضمون مقالات شبلی جلد اول میں چھپ گئے ہیں۔ سید سلیمان ندوی ''حیات شبلی'' میں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''افسوس ہے کہ مولانا نے اس دوسرے مضمون ''مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہیے'' میں ردِ مختار کے جس فقرہ پر اپنے نظریہ کی بنیاد رکھی ہے اس کے صحیح پڑھنے میں ان سے سہو ہوا ہے **ویفتر علینا اتباعھم** میں انھوں نے اتباع'' (پیچھا کرنا) کو اِتّباع (پیچھے ہونا یا تابع ہونا) پڑھا ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''اگر غیر مذہب والے ہمارے مال پر قبضہ کرلیں اور اس کو اپنے گھر میں جمع کریں تو وہ اس کے مالک ہوں گے اور ہم پر ان کی اطاعت فرض ہے لیکن یہ تمام تر غلط ہے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''اگر غیر مسلم حملہ کر کے مسلمانوں کے مال و دولت پر قبضہ کرلیں اور اسکو اپنے ملک یعنی دارالحرب میں لیکر چلے جائیں تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے اور وہ مال مسلمانوں کی ملکیت میں باقی نہیں رہے گا۔ لیکن جب کفار دارالحرب سے آ کر دارالاسلام پر حملہ کر کے مسلمانوں کے مال و دولت پر اس طرح قبضہ کرلیں تو مسلمانوں پر ان حملہ آوروں کا پیچھا کرنا اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ دارالاسلام کے حدود میں ہوں، البتہ جب وہ دارالاسلام کے حدود سے نکل

جائیں اور مال لے کر دارالحرب میں داخل ہو جائیں تو پھر ان کا پیچھا کرنا مسلمانوں پر فرض نہ رہے گا''۔ [دیکھیے شامی حاشیہ رد المختار علی الدّر المختار ج ۳ صفحہ ۲۷۷ مصر، حیات شبلی ۲۳۱۔۲۳۲] شبلی نے مسلمانوں کی محکومیت کے لیے جو حوالہ دیا ہے اس کا کوئی تعلق شبلی کے موقف سے نہیں بنتا اس حوالے کے متن کا تعلق دفاع، تعاقب اور جہاد سے ہے نہ کہ غیر مسلموں کی فرماں برداری اور اطاعت سے سوال یہ ہے کہ شبلی کی عربی کیا اس قدر کم زور تھی کہ وہ ردِ مختار کی عبارت کا درست مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے یہ کیسے ممکن ہے کہ شبلی کے شاگرد سلیمان ندوی اس عربی عبارت کا درست مطلب سمجھنے پر قادر ہوں اور استاد شبلی عربی عبارت کا درست مفہوم اخذ کرنے سے معذور ہوں۔ ظاہر ہے جب مغرب اور اس کے مقاصد کو اہمیت حاصل ہو تو دین کی نت نئی تعبیریں بھی کی جاتی ہیں اور تعبیر نو سے کام نہ چلے تو پھر تحریف و تدلیس سے بھی کام چلایا جاتا ہے واضح رہے کہ شبلی مرحوم نے انتقال سے ساٹھ دن پہلے ایک توبہ نامہ طبع کرا کے بڑے پیمانے پر تقسیم کیا تھا جس میں اپنے ان تمام خیالات سے رجوع کر لیا تھا جو منہج اہل سنت کے خلاف تھے یہ توبہ نامہ اب سلیمان ندوی کی کتاب ''حیات شبلی''میں شامل ہے لیکن شبلی کے مداحین بھی اس توبہ نامے سے ناواقف ہیں۔

جناب جاوید غامدی صاحب نے جہاد پر اپنے مضمون میں السید سابق کی کتاب سے ایک تحریف شدہ حوالہ نقل کر کے اپنا موقف ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ریاست، حکومت، حکمراں کے بغیر جہاد نہیں ہو سکتا انھوں نے سید سابق کا حوالہ دیتے ہوئے دو سطریں حذف کر دیں ڈاکٹر رضوان علی ندوی نے عربی زبان میں ایک ناقدانہ مضمون لکھ کر اس تحریف کی وضاحت کی تفصیلات کے لیے ماہنامہ ساحل، جولائی ۲۰۰۷ء، ص ۴۷ تا ۹۶ ملاحظہ فرمایئے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر رضوان ندوی نے اپنے عربی مضمون **مبداء الجهاد و مقال آخر للاستاذ الغامدی فی المیزان**، میں بتایا ہے کہ غامدی صاحب نے السید السابق کی کتاب سے نامکمل حوالہ نقل کر کے اپنے غلط موقف کی علمی تائید ایک محرف مدلس حوالے سے کرنے کی کوشش کی ہے یہ علمی بد دیانتی ہے غامدی صاحب نے اس عربی

مقالے کا کوئی جواب نہیں دیا۔غلام احمد پرویز،قدرت اللہ فاطمی اور دیگر اہل قرآن اس طرح کی تحریفات عموماً کرتے رہتے ہیں۔

[۴۴] **دینی نصوص کو مشکوک بنانے کے لیے عقلی موشگافیاں پیدا کرنا۔**

چور کا ہاتھ چوری کے جرم میں کاٹا جاتا ہے تو زانی کی شرم گاہ زنا کے جرم میں کیوں نہیں کاٹی جاتی۔ ہاتھ کی دیت ۵۰۰ دینار ہے جو ہاتھ اتنا قیمتی ہے اسے چوتھائی دینار چوری کرنے کے جرم میں کیسے کاٹا جاسکتا ہے؟ یہ حکم عجیب ہے کہ جس جانور کو اللہ خود ہلاک کر دے وہ مردار ہے اس کو کھانا حرام ہے لیکن جس جانور کو انسان تڑپا تڑپا کر ہلاک کر دے اس کا کھانا حلال ہے۔نماز دین کا ستون ہے قانونی اسلام کی شرط اول ہے کہ اگر کوئی نماز پڑھے زکوٰۃ دے تو اسے مسلمان تسلیم کیا جائے گا نماز نہ پڑھنے والے کو بعض فقہاء نے قتل کرنے کا حکم دیا ہے لیکن یہ کیسا قرآن ہے جو عورت کو حیض کے زمانے کی نماز قضاء کرنے کا حکم نہیں دیتا مگر روزوں کے قضاء کرنے کا حکم دیتا ہے؟قتل زنا سے بڑا جرم ہے مگر قتل کے لیے قرآن صرف دو گواہوں کی گواہی کو کافی سمجھتا ہے اور زنا کے لیے چار گواہ لانے کی شرط عائد کرتا ہے معری نے بھی چوری کی سزا پر اعتراض کیا تھا شعر پڑھیے

ید بخمس مئین عسجد ودیت   مابالھا قطعت فی ربع دینار

یعنی انسان کا وہ محفوظ اور مامون ہاتھ جس کی پانچ سو دینار دیت مقرر ہے اور سرِ عام دیت دی جاتی یہ مگر حیرت ہے کہ وہ قیمتی ہاتھ چوری کے معاملہ میں صرف ربع دینار (چوتھائی) پر کاٹ دیا جاتا ہے۔

تحکم مالنا الا السکوت لہ   وان نعوذ بمولانا من النار

یہ تو محض جبراً استبداد پر مبنی حاکمانہ فیصلہ ہے ہم اس پر خاموش رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے بس چپ ہی رہیں گے ہم تو آگ سے اپنے آقا کی پناہ چاہتے ہیں۔

امام شافعیؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

ھناک مظلومۃ غالت بقیمتھا   وھٰھنا ظلمت ھانت علی الباری

پانچ سو دینار کی دیت کی صورت میں جب ہاتھ مظلوم تھا تو اس کی قیمت ظاہر ہے گراں تھی وہ

لائق صد ترحم تھا اور جب اس ہاتھ نے خیانت کردی مجرم بن گیا تو اللہ پاک کی بارگاہ میں ذلیل ہو گیا اور قیمت گرادی گئی۔ علامہ شمس الدین کردی فرماتے ہیں کہ

فقیمة الید نصف الالف من ذھب   فان تعدت فلا تسوی بدینار

لاریب: امانت دار ہاتھ کی قیمت پانچ سو دینار ہے مگر جب یہی ہاتھ خائن بن جائے اور چوری کر کے تعدی کرے تو وہ ایک دینار کے برابر بھی نہیں رہتا۔

قاضی عبدالوہاب مالکیؒ نے اس کے جواب میں عربی کا ایک عجیب فقرہ کہا

لما کانت امینة کانت ثمینة لما خانت ھانت

جب یہ ہاتھ امین تھا تو بہت ہی قیمتی تھا جب خیانت کر کے خائن ہو گیا تو بے قیمت ہو کر ذلیل وخوار ہوا۔

[۴۵] اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآن مجید سے انسانوں کی رہنمائی فرمائی ہے وہیں اس نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اس کی نشانیاں ساری کائنات میں بکھری پڑی ھیں. چنانچہ یورپ ان ھی آیات کی طرف متوجه ھوا جو مظاھر کونیه کی صور ت میں روشن و مبین ھیں، اس طرح یه کھنا بے جا نه ھو گا که یوروپ بھی پوری طرح سے آیات ربانی کے فیضان سے محروم نھیں رھا. اس نے ان آیات کی تلاوت کی اور پورے اخلاص سے ان کی تفسیر پیش کرنے کی کوشش کی اس کے برخلاف مسلمانوں نے مظاہر کونیہ کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں لیکن وہ اپنی حسب بضاعت قرآن حکیم اور سنت رسول سے کسب فیض کرنے کی کوشش کرتے رہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں مشرق کو ذات الہیہ کی طرف بڑھنے کی ترغیب ہوئی وہیں مغرب کو صفات الٰہیہ نے لبھایا۔ ایک قوم ذات کی طرف بڑھتی رہی مگر شیون وصفات سے بے خبر دوسری قوم صفات کی طرف بڑھتی رہی لیکن ذات سے غیر متعارف۔ چنانچہ دونوں میں ایک نے مادی ترقی میں کمال حاصل کیا، لیکن روحانی زوال میں بھی کمال کو پہنچ گئی دوسری قوم نے روحانی ترقی میں کمال حاصل کیا لیکن دنیوی زندگی میں محکوم ومغلوب ہو کر رہ گئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے ہرایک نے نصف صداقت پر

قناعت کر لی اور نصف صداقت سے بے خبری نے انھیں مادی یا روحانی ہلاکت کی منزل تک پہنچا دیا۔اور ہر ایک کے یہاں سئ وصالح خلط ملط ہونے لگے خلطو اعملاً صالحاً واخر سئیاً اس طرح جہاں یہ کہنا صحیح ہے کہ زمانہ حال میں ملت اسلامیہ شدید خطرات سے دوچار ہے وہیں یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ پوری بنی نوع انسانی نہایت نازک وقت سے گزر رہی ہے۔ایک طرف تو مغربی فلسفہ اور سائنس کا علم الحواس ہے اور دوسری طرف مسلم مفکرین کا پیش کردہ وہ سرمایہ ہے جو علم بالوحی سے فیض یاب ہے۔ضرورت ہے کہ علم بالوحی اور علم بالحواس کا ملاپ ہو جائے۔''دراصل مذہب اور سائنس کی منزل مقصود ایک ہے۔اگرچہ ان کی منہاجات ایک دوسرے سے مختلف ہے۔دونوں کو آرزو ہے کہ حقیقت کی تہہ اور کنہ تک پہنچیں۔حتی کہ مذہب جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں سائنس سے کہیں بڑھ کر حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کا خواہش مند ہے مگر پھر دونوں کے نزدیک موجود حقیقی تک رسائی کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی ہے کہ ہم اپنے محسوسات اور مدرکات کی چھان بین کرتے رہیں۔بشرطیکہ ہم محسوسات اور مدرکات میں امتیاز کر سکیں۔سائنس کی دنیا میں تو ہم ان کے معنی حقیقت کے خارجی کردار کی رعایت سے سمجھتے ہیں۔لیکن مذہب کی دنیا میں اس طرح کہ وہ جس حقیقت کی نمایندگی کر رہے ہیں ان کے معنی اس حقیقت کی اندرونی ماہیت کی رو سے سمجھیں۔لہٰذا سائنس اور مذہب دونوں کے اعمال ایک طرح سے پہلو بہ پہلو یعنی باہم متوازی جاری رہتے ہیں۔

[۴۶] **اسلام سائنس ھے اور سائنس اسلام ھے** ان جدیدیت پسند مفکرین کو یہ بھی معلوم نہیں کہ سائنس کی تعریف کیا ہے اگر وہ تاریخ سائنس فلسفہ سائنس یا صرف فلسفہ کی کوئی کتاب پڑھ لیتے تو سائنس کا مطلب جان لیتے اس مضمون کے نکتہ ۱۷ میں ہم نے سائنس کی تعریف کو نہایت آسان الفاظ میں نو نکات میں بیان کیا ہے ان نو نکاتی اوصاف پر مشتمل علم سائنس کہلاتا ہے اسے اسلام کہنا صرف جہالت ہے۔

[۴۷] **جدید معاشروں میں دین کی دعوت کس حد تک سرایت کرچکی ھے اس کو پرکھنے کا واحد مستند پیمانہ عھد حاضر میں صرف ووٹ ھے** الیکشن کے نتائج سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کتنے لوگوں نے ہماری دعوت قبول کی ہے۔حق کے

فروغ کو جاننے کا اس سے زیادہ موثر پیمانہ پوری تاریخ میں کبھی خلق نہیں ہوسکا۔

[۴۸] **انتخابات دعوت دین کو بہت بڑے پیمانے پر لوگوں تک پہنچانے کا سب سے موثر ذریعہ ھے** اگر انبیاء اس عہد میں مبعوث ہوتے تو وہ اسی ذریعے سے اپنی قوت کا اندازہ لگاتے اور اسی طریقے سے آئندہ کی حکمت عملی طے کرتے اور اسی طریقے سے انقلاب برپا کرتے۔

[۴۹] روایتی اسلام کو جدیدیت پسند مفکرین Traditional Islam، Islamic Evanegelism، Fundamental Islam، Orthodox Islam، Political Islam, Theocratic Islam, Revolutionary Islam قدامت پرستی، آبا پرستی، تقلید، دقیانوسی اسلام، وغیرہ کے ناموں سے پکارتے ہیں اور جدیدیت پسند اسلام کے لیے Modrate Islam، Real Islam، Folk Islam، Islamic Intellectualism، Revivalist Islam، New Islam، Islam in new Melinium، Libral Islam، Open Islam، Democratic Islam، Popular Islam، Progressive Islam، Markist Islam وغیرہ کی اصطلاحات سے نمایاں کرتے ہیں۔

[۵۰] **عورت اور مرد مساوی ھیں** اسلامی اور روایتی تہذیبوں میں مساوات نہیں ہوتی عورت مرد انسان نہیں عبد ہوتے ہیں اور عبدیت میں برابر ہوتے ہیں معرفت رب جنس کی تفریق کی بنیاد پر حاصل نہیں ہوسکتی یہ عمل کا میدان ہے مذکر مونث کا فرق یہاں موجود نہیں روایتی اور مذہبی تہذیبوں میں مراتب وجود ہوتے ہیں لوگوں کے درجات متعین ہوتے ہیں ان تہذیبوں میں مرد مرد کے برابر نہیں ہوتا تو مرد عورت کی مساوات کا کیا سوال؟ ہر وجود کا مرتبہ اس کے وجود اور عمل سے متعین ہوتا ہے۔

[۵۱] **نئی نئی اصطلاحات کی تخلیق کے ذریعے جدیدیت پسند اسلام کو ایک متنوع الخیال دین بلکہ چیستان بنانے کی کوشش کرتے ھیں اور** اسلام کو دین کے بجائے ایک ثقافتی تحریک یا تاریخی تحرک باور کراتے ہیں۔ اسی اصول کے

تحت مغربی یونیورسٹیوں میں اسلام یا مذاہب عالم کو ایک مذہب کے طور پر نہ پڑھا اور نہ ہی پڑھایا جاتا بلکہ اسے ثقافتی مطالعات Cultural Studies کے عنوان کے تحت رکھا جاتا ہے مقصود یہ بتانا ہوتا ہے کہ اسلام کوئی علم، علمیت، حقیقت نہیں محض ایک ثقافتی رویہ ہے جو تاریخی تجربے کے نتیجے میں ایک قوم کی میراث قرار پایا ہے جس کی کوئی علمی، علوی، نبوی اور آسمانی بنیاد نہیں ہے۔

[۵۲] ایک صحیح، کامل اور ابدی مذہب کے اوصاف درج ذیل ہیں:
۱۔ مذہب کی صحت کا مدار عقل قرار دیا جائے نہ کہ تقلید، ۲۔ کوئی عقیدہ مذہبی عقل کے خلاف نہ ہو —— ۳۔ عبادات کے یہ معنی نہ قرار دیے جائیں کہ وہ مقصود بالذات ہیں اور خدا ہمارے تکلیفات شاقہ اٹھانے سے خوش ہوتا ہے بلکہ عبادات سے خود نوع انسانی کا فائدہ مقصود ہو اور وہ اعتدال سے متجاوز نہ ہوں —— ۴۔ دینی اور دنیوی فرائض کو اس اعتدال کے ساتھ قائم کیا جائے کہ ایک سے دوسرے کو ضرر نہ پہنچے بلکہ ایک دوسرے کا دست و بازو بن جائے —— ۵۔ مذہب تمدن کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کا ساتھ دے سکے بلکہ خود اس ترقی کا رستہ دکھائے ہم اس کتاب میں اول انہی اصول کے معیار پر اسلام کو جانچنا چاہتے ہیں۔
[شبلی علم الکلام اور اسلام ص ۱۷۴، مسعود پبلشنگ ہاوس کراچی طبع دوم ۱۹۶۷ء]

[۵۳] اسلام کو کسی نہ کسی طرح سائنس کے مطابق ثابت کرنا تا کہ اسلام کی حقانیت اور فوقیت واضح ہو اصلاً اس طریقے کے نتیجے میں سائنس ہی کی حقانیت ثابت ہوتی ہے اور مذہب کو لوگ سائنس کے بنائے ہوئے اصولوں پر پرکھنے لگتے ہیں سائنس پیمانۂ حق و باطل بن جاتا ہے الدین، الحق الوحی پیمانۂ حق و باطل نہیں بنتا۔ یہ کام خواہ کتنی نیک نیتی سے کیا جائے لیکن اس کا نتیجہ گزشتہ سو برس کی تاریخ میں یہی نکلا ہے۔

[۵۴] جتنی شخصی آزادیاں لبرل ازم نے دی ہیں اسلام میں اس سے زیادہ آزادیاں ہیں اور اگر زیادہ نہیں ہیں تو لبرل ازم سے کم بھی نہیں ہیں لیکن فقہی قانونی روایتی اسلام نے جو اجماع امت، مسلک جمہور، اہل السنّت والجماعۃ، منہاج اہل سنت کی اصطلاحات میں اسلامی علمیت کا اجارہ دار ہے اس نے اسلام میں حاصل آزادیوں کے چہرے پر روایتوں قانونی

فقہ، اور چند علماء یا چند مکاتب کے متفق علیہ چند غیر عقلی اصولوں کا پردہ ڈال رکھا ہے لبرل ازم سے ہم نے اسلام میں آزادی کی روایت کی قدر و قیمت پہچانی ہے اور اپنے گمشدہ سرمایہ آزادی کی بازیافت کی ہے فی الاصل لبرل ازم نے آزادی کی متاع بے بہا اسلامی تاریخ اور علمیت سے حاصل کر کے دنیا کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور ہم وہ آزادی بھی دینے پر تیار نہیں جو اسلام نے دی ہے۔ اس صورت میں لبرل ازم کا مقابلہ کیسے ممکن ہو؟ دونوں میں قدر مشترک آزادی ہے مگر اسلامی علمیت کے ورثا یعنی علماء عقیدۂ آزادی کو تسلیم ہی نہیں کرتے یہ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ آزادی اسلام نے دی لیکن شریعت کی تمام پابندیاں ہوں تو آزادی کے کیا معنیٰ؟

[۵۵] مغرب کا بنیادی حقوق کے اطلاق اور نفاذ کے حوالے سے عالم اسلام اور عالم کفر کے لیے دوہرا معیار اس کی منافقت ہے: دوسرے معنوں میں اصل معیار تو وہی ہے یعنی انسانی حقوق جو مغرب نے طے کر دیا ہے مسئلہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے معیارات کے مطابق عالم اسلام کو وہ آزادی عطا نہیں کر رہا جو کفار کو عطا کر رہا ہے جس کے باعث مسلمانوں میں محرومی کا احساس عام ہے۔ یعنی اصولی طور پر مغرب کے عقائد یا ایمانیات، اصول ومبادی، اساسات اور اسلام کے اصول ومبادی میں کوئی فرق نہیں۔

[۵۶] حقیقت وحی سے الہام سے یا عقل سے ملے وہ حقیقت ہی ہوتی ہے غامدی صاحب نے مقامات ۲۰۰۶ء میں ص۱۳۲ پر یہ انکشاف کیا ہے۔

[۵۷] ایمان بالغیب کے معنی یہ ہیں کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے نہیں دیکھے جاسکتے انہیں انسان محض عقلی دلائل کی بنیاد پر مان لے۔ بن دیکھے مانے مگر بن سوچے سمجھے نہیں یعنی وہ چیزیں جو دیکھی نہیں جاسکتیں انھیں عقل کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے مگر ایسی چیزوں کو دیکھنے کا تقاضہ ان کا تجربہ کرنے کا مطالبہ اصلاً سب سے بڑی بے عقلی ہے قرآن کے حقائق بے شک حواس سے ماوراء ہیں لیکن عقل سے ماوراء نہیں ہیں قرآن کے غیبی حقائق کو ہم نے عقل کی میزان میں تولا اور غیب پر ایمان لائے ایمان بالغیب کے معنی یہی ہیں کہ ہم انھیں عقل وفطرت کے قطعی دلائل کے طور پر مانتے ہیں اس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد

ہی مانیں گے (مقامات ۲۰۰۶ء، ص ۶۸، ۶۹)۔ میزان ۲۰۰۸ء میں قرآن کی آیت کا ترجمہ فرماتے ہیں۔

مشیر الحق کی کتاب ۴۳، ۵۰، ۵۱ فوٹو اسٹیٹ ۵۴، ۶۱ فوٹو اسٹیٹ ۶۸، ۶۹، ۷۰

[۵۸] قرآن میں مشاورت کے حکم کا اصل مطلب جدید مغربی جمہوریت ہے۔

[۵۹] مغربی بنکاری نظام کے اصل بانی حضورؐ، حضرت عروہ بن زبیرؓ اور امام ابوحنیفہؒ ہیں یہ سب لوگوں کی امانتیں اپنے پاس رکھتے تھے رسول اللہ نے ہجرت سے پہلے یہ امانتیں حضرت علی کے سپرد کی تھیں کہ اب بینک بند کیا جا رہا ہے رقم کھاتے داروں کو واپس کر دو۔

[۶۰] جدید سیکولر یونیورسٹی آکسفورڈ کیمبرج وغیرہ کا تصور مغرب نے مسجد نبوی میں قائم دنیا کی پہلی یونیورسٹی صفہ سے اخذ کیا ہے؟

[۶۱] مغرب نے لوگوں کی کفالت کا نام، فوٹو اسٹیمپ اسکیم، بے روزگاری الاؤنس اسلام سے اخذ کیا ہے۔

[۶۲] فرانس اور مغرب میں اسکارف پہننا مسلم عورت کا حق [Right] ہے اس پر پابندی بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ دوسرے معنوں میں اسکارف پہننا اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم نہیں بلکہ ہر انسان آزاد ہے چاہے تو اسکارف پہنے یا نہ پہنے اگر مغرب میں اسکارف نہ پہننا حق ہے تو اسکارف پہننا بھی حق ہے اس طرز فکر کے نتیجے میں خیر کی بحث بے معنیٰ ہو جاتی ہے۔

[۶۳] مغرب اور اسلام دونوں جگہ انسان ہے منشور بنیادی حقوق اور خطبہ حجۃ الوداع اسی مشترک انسان کے حقوق بیان کرتے ہیں منشور بنیادی حقوق خطبہ حجۃ الوداع سے اخذ کیا گیا ہے دنیا کا پہلا منشور انسانی حقوق خطبۃ حجۃ الوداع ہے۔

[۶۴] سائنسی علم وحی کے برابر ہے بلکہ وحی کی بہترین شکل ہے اور سائنس کو وحی الٰہی نے ہی یہ مقام دیا ہے لہٰذا سائنس اصلاً وحی کی تصدیق کے بعد خود مثل وحی بن گئی ہے۔ بہت سی آیات قرآنی کا فہم سائنسی علوم کے بغیر حاصل ہی نہیں کیا جا سکتا۔

[۶۵] وحی الٰہی، عقلی علم، پیغمبر کا علم، سائنسی علم میں کوئی تضاد ممکن نہیں تمام علوم کا سرچشمہ ایک ہی ہے

یعنی ذات خداوندی وحی کا خالق بھی اللہ ہے عقل کا خالق بھی اللہ ہے پیغمبر کا خالق بھی اللہ ہے لہٰذا اس ایک خالق کی مخلوق کا علم خواہ وحی ہو، پیغمبر کا علم ہو یا عقل انسانی سے حاصل کردہ علم یہ سب یکساں سطح کا علم ہوگا اس میں تضاد اگر نظر آ رہا ہے تو یہ ہمارے فہم کا نقص اور عقل کا قصور ہے۔

[٦٦] لا ادری کہنا سب سے بڑی جہالت ہے لہٰذا ہر مسئلے ہر معاملے ہر عقدے پر آزادانہ بے باکانہ رائے دینا علم کا تقاضہ ہے خواہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے جدیدیت پسند مسلم مفکرین عموماً اپنے علم میں خود کفیل ہوتے ہیں انہیں دنیا کا ہر علم حاصل ہوتا ہے لہٰذا کسی سے علم حاصل کرنے کی حاجت محسوس نہیں کرتے لہٰذا آزادی اظہار رائے کے سب سے بڑے وکیل اور اسی خنجرِ مغرب کے سب سے بڑے قتیل ہیں۔

[٦٧] صرف سائنس داں ہی قرآنی آیات کائنات کا مطلب بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں کہ انہیں نیچرل سائنسز کا علم حاصل ہے ان علوم سے محروم شخص نیچرل سائنسز سے متعلق آیات قرآنیہ کو پڑھتے ہوئے کوئی گہرا اثر نہیں لے سکے گا اور سرسری طور پر گزر جائے گا ان آیات کا صحیح فہم جدید سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے ممکن بنایا ورنہ ان آیات کا مخفی فہم حاصل کرنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا ان معنوں میں سائنس کفار کے ذریعے ہم تک پہنچی لیکن اس نے دین کی بے مثال خدمت کی ہے یہی اللہ کی حکمت بالغہ ہے ع پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے۔

[٦٨] قرآن اللہ کا کلام [Word of God] اور یہ کائنات اللہ کا کام [Work of God] ہے دونوں میں عدم مطابقت ممکن نہیں ایک قرآن لفظی ہے یعنی صحیفۂ آسمانی ایک قرآن فطری ہے یعنی صحیفہ کونیاتی دونوں ایک دوسرے کی تفہیم وتشریح کرتے ہیں دونوں کے ذریعے حقیقت اولیٰ تک رسائی ممکن ہے۔ دونوں یکساں سطح کے مساوی علوم ہیں پیغمبر کے ذریعے خدا تک پہنچنے والا سائنس کے براہ راست مشاہدات یعنی کائنات کے راست مشاہدے سے خدا تک پہنچ سکتا ہے انہی معنوں میں دانش پہلی وحی ہے اور عقل کا پیغمبر باطن قیامت تک انسان کو خدا سے ملاتا رہے گا۔

[٦٩] قرآن حکم کی وہ آیات جو تذکیر بالا اللہ سے تعلق رکھتی ہیں ان کی تفہیم جدید سائنسی علوم کے

بغیر محال ہے سائنس کے بغیر یہ آیات ہمارے لیے آیات متشابہات بن جائیں گی جن کا فہم اب روز آخرت ہی مل سکے گا رسالت مآب کا فرمان ہے کہ **لا تنقضی عجائبہ** قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوسکیں گے اس کا مقصد جدید سائنس کی طرف اشارہ تھا کہ جیسے ہی یہ سائنس طلوع ہوگی اور ارتقاء پذیر رہے گی تو قرآنی عجائبات کی تشریح وتفسیر کرتی چلی جائے گی کیونکہ علوم کا یہ باب حواس اور مشاہدے وتجربے سے تعلق رکھتا ہے جو صرف اور صرف سائنسی تحقیقات سے ہی ممکن ہے۔

[۷۰] ہر مفسر اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق تفسیر قرآنی کرتا ہے اب نیا دور ہے جس میں تجرباتی علوم [Experimental Sciences] اور فطری علوم [Natural Sciences] کو بہت اہمیت حاصل ہے لہٰذا اب ان ہی علوم کی روشنی میں سائنسی تفسیر عقل کا تقاضہ، عصر کا مطالبہ اور شریعت کا حکم۔ خدا اور اس کے پیغمبر کی اتباع ہے۔

[۷۱] نیچرل سائنس کے عالی سائنس دانوں کے بغیر جو دین کے علم سے بھی واقف ہوں قرآن حکیم میں موجود آیات کائنات اور آیات مشابہات کی تفہیم میں بہت سے خلاء ہمیشہ باقی رہیں گے ایسے علماء کو پیدا کرنا امت کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ امت نے یہ کام نہ کیا تو زوال سے نہ نکل سکے گی۔

[۷۲] زکوٰۃ ٹیکس ہے اسلامی ریاست میں حکمراں صرف زکوٰۃ کا Tax لگا سکتے ہیں اس کے سوا کوئی اور محصول [Tax] حرام ہے اگر مفاد امت میں محصول لگانا لازم ہو تو یہ کام صرف اور صرف امت کے علماء اور فقہاء کی اجازت سے اس وقت ہوسکتا ہے جب بیت المال خالی ہو ورنہ یہ حرام ہے حدیث ہے Tax وصول کرنے والا جہنمی ہے۔ زکوٰۃ کا نصاب وہ نہیں ہے جو فقہاء نے بیان کیا ہے نوکری کرنے والا ہر مہینے اپنی تنخواہ پر بیس فی صد زکوٰۃ دے کاروبار کرنے والا ہر روز کے منافع پر بیس فی صد زکوٰۃ دے زکوٰۃ سالانہ بنیاد پر نہیں عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق روزانہ یا ماہانہ بنیاد پر ہوگی دیگر امور میں یہ سالانہ بنیاد پر دی جاسکتی ہے۔

[۷۳] کوئی جدیدیت پسند مفکر مغرب پر تنقید نہیں کرتا زیادہ سے زیادہ تنقید یہ ہوتی ہے کہ مغرب

سراسر خیر ہے بس وہ کلمہ پڑھ لے اور عریانی فحاشی ترک کر دے اس کے سوا مغرب میں انہیں کوئی بڑی، اہم، بنیادی، خلقی، باطنی، خامیاں نظر نہیں آتیں بلکہ اکثر یہ کہتے ہیں کہ مغرب اسلام ہی کی ایمان سے محروم ترقی یافتہ مگر محرف شکل ہے اس کا ظاہر ٹھیک ہے باطن کی اصلاح کی ضرورت ہے تمام جدیدیت پسند مسلم مفکرین مغرب کی تاریخ، فلسفے، سائنس، نظریات، اداروں کے بارے میں تنقیدی تحقیق کرنے کے بجائے تحقیق کا رخ اسلام کی طرف موڑ دیتے ہیں اور تمام خامیاں، غلطیاں، کوتاہیاں، گمراہیاں انھیں پہلی صدی میں ہی اسلام، تاریخ اسلام، صحابہ، علماء، فقہاء، صوفیا، مجتہدین میں نظر آنے لگتی ہیں اسلامی علوم، اسلامی شخصیات، اسلامی ریاستیں انھیں حقیر دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی تنقید و تحقیق کا رخ مغرب کے بجائے اسلامی تاریخ، اسلامی اصطلاحات شخصیات علامات اور ادارے ہوتے ہیں وجہ یہ ہے کہ مغرب پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ جو بات فہم سے بالا ہو اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی جائے ایمان تحقیق کا محتاج نہیں رہتا بن دیکھے ایمان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا ناقدانہ جائزہ یا تخلیقی تخیلاتی محاسبہ کیا جائے ایمان تو ایمان ہوتا ہے لہٰذا مغرب کے بارے میں یہ مفکرین تحقیق نہیں کرتے ان کی تمام تحقیقات، تنقیدات، اعتراضات، شبہات، سوالات کا ہدف اسلام، اسلامی تاریخ اسلامی علمیت، فقہ اور اکابرین امت ہوتے ہیں ایک ایک کو چن چن کر نشانہ بناتے ہیں۔ اسلامی علمیت سے جو مسئلہ ان کے سامنے ثابت ہو وہاں کہتے ہیں **سمعنا وعصینا** کہ میں نے دین کا مسئلہ سن لیا مگر میں اس کی تکذیب کرتا ہوں اسے قبول نہیں کرتا اور مغربی علمیت مغربی تاریخ سے جو نتیجہ، نظریہ، اصول، دلیل سامنے آئے اسے سنتے ہی کہتے ہیں **سمعنا واطعنا**۔ کہ میں نے آپ کا فرمان سن لیا اور میں دل و جان سے اس کی اطاعت، قبولیت کا اقرار کرتا ہوں۔

[۷۴] کسی مذہبی کام، مذہبی عمل کی اجازت کے لیے حق [Right] کی اصطلاح کو استعمال کرنا کہ یہ میرا حق ہے نہ کہ ایک خیر کو انجام دینے کے لیے اسے خیر مطلق Absolute Good کے طور پر پیش کرنا کہ یہ میرے اور تمہارے رب کا حکم ہے۔ منشور بنیادی حقوق کے اس طریقے کو اختیار کرنے کے نتیجے میں حق کی بحث حق کی سیاست [Politics of

[Rights] شروع ہو جاتی ہے اور خیر کی بحث خیر کی سیاست [Politics of Good] ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جہاں بھی منشور بنیادی حقوق کو اہمیت حاصل ہوتی ہے ان معاشروں میں تمام جدوجہد صرف اور صرف مادی معاشی فلاحی حقوق سے وابستہ ہو جاتی ہے مفاد پرستی اور مادہ پرستی کی جدوجہد خواہش طلب جستجو کے سوا کوئی دوسری خواہش طلب باقی ہی نہیں رہتی۔

[۷۵] ترقی مسلسل مستقل ترقی، معیار زندگی میں مسلسل مستقل اضافہ دین کو مقصود اور مطلوب ہے دین کے مقاصد میں اس مقصد سے دین کی قوت وشوکت میں اضافہ ہوتا ہے ترقی ہو تو اہل دین خود جدت وایجادات کرتے ہیں ترقی معطل یا منسوخ یا متروک ہو جائے تو دوسروں کی جدت وایجادات کے استعمال کنندہ یا نقال بن جاتے ہیں دوسروں کی ایجادات آتی ہیں تو وہ ٹرائے [Troy] کا گھوڑا ہوتی ہیں جو دینی علمیت میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں مسلمان اگر خود ترقی کر لیتے تو جدید سائنس کے ٹرائے کے گھوڑے کے اندر سے برآمد ہونے والے مغربی تہذیب کے لشکر سے اس کی روایات، اقدار، عقیدوں سے محفوظ رہتے۔ مسلمان علوم عقلیہ میں مغرب سے فائق ہوتے تو ان سے کچھ درآمد نہ کرتے۔

[۷۶] جب تک GNP، GDP، GNI، HDI میں اضافہ نہ ہو ہم طاقت ور نہیں ہو سکتے جب تک ہم معاشی مادی ترقی میں مغرب کے ہم پلہ نہ ہوں اس کا مقابلہ ممکن نہیں ہے۔ الدین الحق، قرآن وسنت اسلامی ریاست کے مقاصد کو ان جدید اہداف کے مطابق سمجھتے ہیں **ربنا اتنا فی الدین حسنة وفی الاخرة حسنه** کا مطلب یہی ہے کہ دنیا بھی بہتر ہو اور آخرت بھی جس کی دنیا ہی بہتر نہ ہوسکی اس کی آخرت کیسے بہتر ہوگی مغرب کی جدید اصطلاحات، جدید اشاریے Indexs، اسلامی علمیت کے جدید اظہارات ہیں عہد حاضر کے محاورے میں یہ کلام دراصل اسلام کی دانش روحانی کی ہی بازیافت ہے۔

[۷۷] مغرب کے منشور حقوق انسانی میں عطا کردہ انسانی حقوق اصلاً حقوق العباد ہیں یہ حقوق سب سے پہلے قرآن نے دیے اور خطبہ حجۃ الوداع میں ان کو دہرایا گیا۔ جدیدیت پسندوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ منشور حقوق انسانی میں ''انسان'' سے مراد کون ہے؟ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ دنیا

کی ہر تہذیب میں حقوق ہوتے ہیں لیکن وہ مجرد حقوق نہیں ہوتے وہ کسی نہ کسی تصور خیر اعلیٰ [concept of hyper good] سے نکلتے ہیں حقوق العباد۔ کا تعین کتاب اللہ کرتی ہے کیونکہ یہ حقوق بندوں کے لیے ہیں اس لیے یہ حقوق اس انسان کے لیے ہیں جو اللہ کی بندگی کا قائل ہے وہ ہر کام خدا کو برتر ہستی سمجھ کر کرتا ہے اس کے برعکس انسانی حقوق ایک ایسے فرد کے لیے ہیں جو مطلق آزاد ہے جو کسی خدا کو نہیں مانتا جس کا ایمان صرف اور صرف آزادی میں مسلسل و مستقل اضافے پر ہے جو کسی کو جواب دہ نہیں جو فاعل مختار مطلق ہے جو حق خودارادی کا حامل [Right of self determination] فرد ہے جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے اور جس کا مقصد آزادی میں لذتوں میں معیار زندگی میں مسلسل مستقل اضافہ ہے اسلام ایسے تصورات کو ہی تسلیم نہیں کرتا لہٰذا یہ کہنا کہ مغرب کے حقوق انسانی اور اسلام کے حقوق العباد ایک ہیں مغرب اور اسلام کی مابعد الطبیعیات سے ناواقفیت کا شاخسانہ ہے مثلاً ایک مذکر عبد کسی مرد سے شادی کرنا چاہے تو اسلام میں یہ اس کا حق نہیں ہے اگر وہ اس خواہش پر عمل کرے تو اس کی سزا نہایت عبرتناک ہے حقوق انسانی کے منشور کے تحت ہر فرد آزاد ہے اور Right of self determination، Right of Freedom، Right of association کے تحت عورت عورت سے، مرد مرد سے جڑ سکتا ہے شادی کر سکتا ہے یہ اس کی مرضی ہے خواہش ہے آزادی ہے اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی جا سکتی جرمنی میں جانوروں کے قحبہ خانے میں ایک لاکھ جرمن لوگ جانور کرائے پر لے کر ان سے جنسی تمتع کرتے ہیں جانور تک پریشان ہیں کہ کس زمانے میں پیدا ہو گئے ہیں۔ حقوق العباد کے نظام میں عبد کی خواہشات کا تعین قرآن و سنت کریں گی حقوق انسانی کے نظام میں عبد کی خواہشات کا تعین فرد اس نظام زندگی کے طے کردہ اصول اور منہج کے اندر کر سکے گا یعنی اس کی خواہش تمنا آزادی [Freedom] کے اصول کے خلاف نہ ہو اور ارادہ عامہ [General Will] سے متصادم نہ ہو۔ ذاتی زندگی میں اپنے کمرے میں تنہائی میں نجی دائرے میں آزادی اور ارادہ عامہ کے خلاف جو چاہے کرے کیونکہ اس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا لیکن اگر وہ اس دائرے کو بیوی بچوں خاندان محلے

تک اس طرح وسیع کرے کہ لوگوں کی آزادی اور آزادی کے نظام کو خطرہ لاحق ہو تو اسے بلیک پینتھر مومنٹ کے ہزاروں کارکنوں کی طرح قتل کردیا جائے گا اگر وہ نظام سرمایہ داری کے لیے مہیب خطرہ نہیں بنتا صرف گھر والوں محلے والوں کے لیے مسائل پیدا کرے تو قانون حرکت میں آکر اس کی آزادی کو صرف اس کے نجی دائرے تک محدود کردے گا اور دائرہ توڑنے پر اسے سزا بھی دے گا۔

[۷۸] نکاح ایک معاشرتی معاہدہ [Social Contract] ہے دو فریقوں کا معاہدہ [Agreement] ہے جسے جب چاہے ختم کیا جاسکتا ہے۔ نکاح ایک معاشرتی معاہدہ نہیں ایک دینی روحانی ایمان معاہدہ ہے یہ پیغمبر کی سنت ہے اور نسل آدم کی ضرورت ہے خطبہ نکاح میں اللہ کو گواہ بنا کر اس معاہدے کا اقرار کیا جاتا ہے یہ معاہدہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے ربانی روحانی عہد کے ساتھ عمل میں آتا ہے اس لیے جو نکاح زمین پر قائم ہوگا وہ قیامت میں آخرت میں بھی باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ کو جائز کاموں میں سب سے ناپسندیدہ کام طلاق ہے۔

[۷۹] کوپرنیکس، کیپلر، گیلیلو اور نیوٹن کا یہ اعتقاد کہ خدا نے کائنات کو ریاضی کے اصول کے مطابق منظّم کیا ہے لہٰذا خدا کا عرفان کتاب فطرت جو درحقیقت خدا کا کام [Work of God] اور دوسرا قرآن یعنی کتاب فطرت [Book of Nature] ہے کتاب فطرت سے خدا کا عرفان کتاب لفظی [Work of God/Revelation] سے زیادہ بہتر طریقے سے ہوسکتا ہے دوسرے معنوں میں انسان اپنے حواس خمسہ، عقل، وجدان، چھٹی حس، تجربے کے ذریعے حصول علم میں خود کفیل ہے اسے خدا کی معرفت کے حصول کے لیے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، پیغمبر کے اصحاب، علماء صحبت صالح کسی کی ضرورت نہیں ہے انسان براہ راست کتاب فطرت کے ذریعے انسانی وسیلے کے بغیر صرف خدا کے عطا کردہ وسیلے فطرت کے ذریعے عرفان حق کا ادراک کرسکتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے عبد ہونے اپنی بنیادی حاجت تحدید اور بندگی کا انکار کر کے مذاہب سماوی کی بنیادی بصیرت کا بھی منکر ہوجاتا ہے مگر اس انکار کا حسن اور جمال یہ ہے کہ وہ خدا تک بہتر رسائی کے نعرے کی گونج میں انکار کا فریضہ

انجام دیتا ہے یہ رویہ انسان پرستی یعنی الوہیت انسانی کے مماثل ہے کہ انسان خدا ہے جو کسی کا محتاج نہیں خود کفالت کی یہ منزل وہ ہے جہاں معرفت رب کے لیے انسان کی ذات ہی کافی ہے لہٰذا جب انسان خود خدا بن جاتا ہے تو خدا کی معرفت کا سوال بھی اس کے لیے بے معنی، لغو اور مسترد کرنے کے لیے قابل ہو جاتا ہے۔ مغرب میں عیسائیت، مذہب، خدا، آخرت کا انکار انسان پرستی کے اسی طریقے سے کیا گیا کانٹ کا مضمون What is enlightenment انسان پرستی کی فلسفیانہ بنیادوں سے آگاہ کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ انسان وہ ہے جو علم میں خود کفیل ہے وہ علم کے لیے اپنے اندرون سے رجوع کرتا ہے بیرون سے نہیں وہ وحی، پادری اور ڈاکٹر سے ہدایت نہیں لیتا وہ ہدایت کے لیے کسی کا محتاج نہیں خارجی ذرائع علم سے .انکار کرنا ہی انسانیت کا تقاضہ ہے روشن خیالی اسی لمحے، اسی تصور اسی فکر اسی جستجو کا نام ہے جب انسان نے خارجی ذرائع سے علم حاصل کرنے کو ترک کر دیا اور حصول علم، ہدایت، رہبری، روشنی کے لیے خود اپنے آپ پر انحصار کیا۔ اس رویے کے نتیجے میں مغرب میں معاشرہ اور تہذیب جو پہلے خدا مرکز [Theocentric] تھے اچانک انسان مرکز [Humancentric] ہو گئے۔ مارٹن لوتھر کی پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح نے خدا مرکز کائنات کے انسان مرکز کائنات میں تبدیلی کا مذہبی جواز پیش کیا انسان کی علم میں خود کفالت کا دعویٰ وحی کے حصول کے وسیلوں کا انکار تھا یعنی کتاب اور نبوت اور نبوت سے فیض یاب ہونے نفوس قدسیہ جبکہ وسیلوں کا اقرار اور ان کی ضرورت کا احساس عبدیت کا تقاضہ اور اور ان پر ایمان لانا انسان کی تحدید کا اقرار ہے وسیلۂ کتاب و نبوت کا اقرار عین بندگی ہے اور اس کا انکار اپنے خدا ہونے کا اعلان ہے۔ جدیدیت کا بنیادی عقیدہ انسان کی خدائی کا اقرار ہے تحریک اصلاح واحتجاج کے ذریعے مارٹن لوتھر نے انسان پرستی اور سرمایہ داری کے جدید مذہب کا مذہبی تعقل بیان کر کے جدیدیت کو قوت مہیا کی۔ جو دنیا میں کامیاب ہے وہی آخرت میں کامیاب ہے شریف آدمی وہ ہے جو امیر آدمی ہے دنیا میں سب سے زیادہ کامیاب بادشاہ ہے لہٰذا بادشاہ ہی ٹھیک ہے وغیرہ وغیرہ

[۸۰] اسلام کو مغرب کی طرح تحریک نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے جو حالات کا تقاضہ ہے یہ دعویٰ

کرنے والے مغرب کے رینے ساں کی تحریک کی علمی فلسفیانہ بنیادوں سے قطعاً واقف نہیں ان کا دعویٰ نہایت سادگی اور اخلاص پر مشتمل ہے مگر اخلاص اور سادگی علم کا متبادل نہیں بن سکتے نشاۃ ثانیہ کا اصل مطلب ہے وحی پر مبنی اور نقلی علوم کو بے اعتبار، لایعنی، غلط، بے اعتبار بلکہ جہالت عظمیٰ سمجھنا اور عقلیت اور انسان پرستی کو اختیار کرنا اسی لیے مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا دوسرا نام انسان پرستی [Humanism] ہے یعنی ہر بات پر صرف اور صرف انسان کے نقطۂ نظر سے غور کرنا اس تحریک نے جو طرز فکر اور طرز زندگی پیدا کیا اس میں تمام علوم کا سرچشمہ عقلیت پرستی اور تجربیت [Rationalism & Impericism] تسلیم کیا گیا لہٰذا سائنسی علوم اصل العلوم قرار پائے جو علم سائنس کی میزان پر پورا نہیں اترتا وہ جہالت ہے لہٰذا تمام غیر تجربی علوم۔ علوم کے دائرے سے باہر نکال دیے گئے کتاب فطرت کو کتاب الٰہی پر فوقیت دی گئی کہ خالق فطرت کو جاننے کے لیے کتاب الٰہی سے زیادہ موثر کتاب فطرت ہے جس کا ہر انسان براہ راست مشاہدہ کرسکتا ہے۔ لہٰذا فطرت پرستی کی تحریک مغرب میں آندھی اور طوفان کی طرح چھا گئی اس تحریک کی تاریخ کے لیے رفعت حسن کی کتاب ''حالی اور سرسید کا نظریہ فطرت' ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور پڑھی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب محمد حسن عسکری کی رہنمائی میں لکھی گئی تھی۔ بیکن نے سائنسی علمی طریقے کے ذریعے بتایا کہ چیزوں کی حقیقت صرف مشاہدے اور تجربے سے معلوم کی جاسکتی ہے اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ جس چیز کا مشاہدہ نہ کیا جاسکے یا وہ شے جو ہمارے حسی تجربے میں نہ آسکے وہ حقیقی نہیں ہوتی فطرت کے مطالعے کا مقصد خالق فطرت کی معرفت کے بجائے تسخیر کائنات ثابت ہوگیا تا کہ کائنات سے زیادہ سے زیادہ تمتع کیا جاسکے اور وسائل کی فراوانی سے قوت حاصل کی جائے تسخیر فطرت کا مطلب صرف طاقت کا حصول ہوگیا کیونکہ انسان خدا بن گیا اور اسے خدائی کے لیے طاقت بھی درکار تھی تسخیر کائنات کے نتیجے میں ماحولیاتی آلودگی کے مسائل نے تدفین کائنات کا فریضہ انجام دیا۔

[۸۱] استقرائی منطق کا خالق قرآن ہے (زاہد مغل جریدہ)

[۸۲] دین میں معروف و منکر کا تعین فطرت انسانی بھی کرسکتی ہے یعنی خیر و شر کی کسوٹی الدین کے

سوا فطرت انسانی بھی ہوسکتی ہے لہٰذا الدین اور فطرت انسانی یکساں درجے کے ذرائع علم ہوگئے۔

[۸۳] تغیر دوامی اصول ہے کیونکہ دنیا بدل رہی ہے لہٰذا کسی شے اور کسی علم کو دوام نہیں ہے علم کا تقاضہ ہی تغیر ہے۔

[۸۴] اصل الاصول ارتقاء ہے ارتقاء سنت بھی ہے اور فطرت بھی لہٰذا مذہب کو ارتقاء پذیر زندگی کے ساتھ متغیر ہونا چاہیے۔ کیونکہ ثبات اس دنیا میں حقیقتاً صرف اور صرف تغیر کو حاصل ہے۔

[۸۵] کلام عرب قرآن کے فہم حقیقی کے حصول کا واحد دروازہ ہے اس دعوے میں ذات رسالت مآب، سنت محبوب الٰہی، تعامل صحابہ وغیرہ کے تمام دروازوں کا انکار کردیا گیا یہ رویہ مغرب کے مارٹن لوتھر کی تقلید ہے جس نے فہم انجیل کو ہر فرد کی عقل سے مشروط کیا اور لوگوں کو آزادی دی کہ وہ انجیل خود پڑھیں اسے علماء سے پڑھنے کی قطعی ضرورت نہیں علماء کا وجود خدا اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق قائم کرنے میں سب بڑی رکاوٹ ہے۔ دعوت رجوع الی الانجیل کی اس زبردست تحریک کے نتیجے میں آخر کار انجیل سے لوگوں کا تعلق ہی ختم ہوگیا۔

[۸۶] عقل و دانش پہلی وحی ہے۔

[۸۷] تاریخ دین کے حصول کا ذریعہ بھی ہے اور ماخذ بھی ہے خبر واحد ماخذ دین نہیں ہے۔ خبر واحد کو تسلیم نہ کرنا اور تاریخ کو دین کے حصول کا ذریعہ اور دین کا ماخذ تسلیم کرلینا عجیب رویہ ہے۔

[۸۸] دانش پہلی وحی ہے اور قرآن دوسری وحی۔ چونکہ ہر انسان کے پاس پہلی وحی اللہ کی وحی ملنے سے پہلے ہی موجود ہے لہٰذا انسان وحی کے معاملے میں خود کفیل ہے اگر دوسری وحی قرآن اس تک نہ بھی پہنچے تو وہ پہلی وحی کے ذریعے ہی معرفت حق اور حقیقت الحقائق تک پہنچ سکتا ہے۔

[۸۹] ہر وہ تہذیب اسلامی ہے جو تین اساسات قبول کرے۔(۱) وحدت الہ، (۲) وحدت آدمؑ، (۳) عمل کی بنیاد پر ابدی مکافات۔ رہن سہن اور آداب و شعائر کے ہزار اختلافات کے باوجود ہم اسے اسلامی تہذیب قرار دے سکتے ہیں لہٰذا کسی خاص قالب کو اسلامی تہذیب نہیں قرار دینا چاہیے۔

[۹۰] اجماع حجت نہیں ہے۔

[۹۱] اسلام میں جمہوریت اور عوامی قوت کی اصطلاحات معروف رہی ہیں مثلاً جمہور اجماع وغیرہ عوامی اکثریت ہی کا تو اظہار ہیں مغرب کی جمہوریت نے عوام کی جمعیت کا تصور اسلام سے ہی لیا ہے۔

[۹۳] عصر حاضر میں دین کی تعمیر نو، تعبیر نو، تشکیل نو، اصلاح دین کی ضرورت ہے انگریزی میں متجددین اسے Reconstruction of Religions Thought، Reformation of Islamic Thought اور Protestanization of Islam بھی کہتے ہیں یعنی مارٹن لوتھر نے جس طرح عیسائیت کے کیتھولک ازم کی اصلاح کے لیے تحریک احتجاج برپا کر کے عیسائیت کو کمزور کیا اور انجیل کی تعبیر و تشریح کا حق ہر عیسائی کو دے کر اباحیت اور الحاد کا دروازہ کھولا لیکن اس کام کے لیے جو نعرہ استعمال کیا گیا وہ تھا کہ لوگ دین کے لیے براہ راست انجیل سے رجوع کریں۔ کلام خالق اور مخلوق کے مابین کسی وسیلے، ذریعے، ہستی کو حائل ہونے کا حق حاصل نہیں دین براہ راست بغیر کسی ذریعے کے ہر فرد حاصل کر سکتا ہے اس آزادروی کے نتیجے میں انجیل کی آیات کی ایسی ایسی تشریحات کی گئیں کہ خود لوتھر کی تحریک کے حامی علماء بھی پریشان ہو گئے کیتھولک ازم اور یورپ کی حیثیت کو کم بلکہ ختم کرنے کے لیے لوتھر ازم نے Divine Right of King کے اصول کے ذریعے اقتدار پوپ سے بادشاہ کو منتقل کیا کہ وہ ظل اللہ ہے اس زمین پر اللہ کا سایہ ہے اور جو شخص دنیا میں کامیاب ہے وہی آخرت میں بھی کامیاب ہے لہٰذا رفتہ رفتہ یہ اختیار و اقتدار لبرل مفکرین کے ذریعے بادشاہ سے عوام کو منتقل ہو گیا جسے Divine Right of Citizen کہتے ہیں اس کے نتیجے میں جمہوریہ Republic وجود میں آئی جس نے اجتماعی زندگی سے مذہب کو خارج کر کے آزادی Freedom کو ہر فرد کا عقیدہ ریاست کا مذہب اور انسانیت کا مقصد قرار دیا جس کے بعد مذہبی زندگی اور مذہبی تعقل غیر عقلی قرار پایا اور غیر مذہبی تعقل دنیا کا غالب قانون بن گیا جسے اب منشور بنیادی حقوق کے مذہب میں تبدیل کر دیا گیا جسے مغرب کے مفکرین Civil Religion کہتے ہیں یہی عہد حاضر کا

عالمی مذہب ہے اور UNO اس مذہب کا محافظ اور مناد [Progagator] ہے۔

[۹۴] قرآن اجمال ہے سائنس قرآن کی تفصیل ہے۔

[۹۵] نبی بشیر ونذیر ہوتا ہے وہ ہر شخص کو خبر دیتا اس سے آگاہ کرتا اور اطلاع دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے عقل انسانی یعنی پیغمبر باطن کے ذریعے پیغمبر ظاہر کا متبادل میڈیا بنادیا ہے بلکہ میڈیا کا حلقہ اثر اور دائرہ کار پیغمبر ظاہر سے زیادہ ہے پیغمبر ایک خاص قوم، علاقے، جغرافیائی وحدت تک محدود ہوتا ہے کل عالم کے لیے پیغمبری عملاً ممکن نہیں اسی لیے کافۃ للناس کے دائرے کے لیے بھی میڈیا ضروری ہے جو ایجاد ہوگیا ہے یہ دین کی تکمیل ہی کا ذریعہ ہے کہ تمام اقوام عالم پر پیغام اسلام پہنچا کر حجت تمام ہو جائے کوئی دعوت سے محروم نہ رہے اور شکوہ نہ کر سکے کہ مجھ تک دین نہیں پہنچا۔ اس بارے میں ہمیں کفار کا شکر گزار ہونا چاہیے نہ کہ ان کا ناقد

[۹۶] مجدد وہ ہے جو تعقل غالب Dominanant Discourse، حاضر و موجود نظام زندگی، رائج افکار و نظریات کو اسلام سے ثابت کر کے دکھا دے کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اسلام اصلاً اسی کی تائید و توثیق کے لیے آیا تھا یہ المیہ ہے کہ یہ سب کچھ مسلمان نہیں کر سکے کفار نے قرآن پڑھے بغیر وہ کر دکھایا جو الدین الحق الاسلام کو مطلوب تھا۔

[۹۷] مغرب کی مسلسل مستقل مادی ترقی کو جوں کا توں اختیار کر لینے کے باوجود مسلمان اپنی روحانیت کو یقیناً برقرار رکھ سکیں گے خیر القرون کی روحانیت، جدید محیر العقول ترقی، اعلیٰ معیارات زندگی اور تعیشات دنیا کے ساتھ یقیناً ممکن ہے بلکہ امکان ہے کہ عہد حاضر کے مسلمان ہر اعتبار سے پچھلوں سے بہتر ثابت ہوں وہ حدیث کہ جو دنیا کو ترجیح دے گا وہ یقیناً اپنی آخرت کا نقصان کرے گا اور جو آخرت کو ترجیح دے گا وہ یقیناً اپنی دنیا کا نقصان کرے گا ایک خاص تناظر میں ہے ایک خاص واقعے کے لیے ہے اس کو عموم پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔ لہٰذا یہ خطرہ کہ مغرب کی بے خوف و خطر مادیت کو اختیار کر کے مسلمان روحانیت سے محروم ہو جائیں گے محض دعویٰ ہے اور خوف ہے

[۹۸] جدید سائنس کا مقصد کائنات کی دریافت نہیں اس کائنات پر غلبہ، تسلط اور اقتدار ہے تا کہ تمتع فی الارض کے ذریعے حیات انسانی کی مشکلات کو کم کیا جا سکے اسلام کا اصول یہی ہے کہ

یسر کو عسر پر ترجیح حاصل ہے رسالت مآب ہمیشہ آسان راستے کی سہولت دیتے تھے ان معنوں میں جدید سائنس دین کی حکمت یسر کی واقعی، حقیقی، مادی تعبیر ہے اور مقاصد شریعہ کو ممکن بنانے کا ذریعہ ہے۔ یہ مومن کی متاع گم شدہ ہے اسے حاصل کرنا ایمان کا تقاضہ ہے۔عسُر سے نجات اور یسُر کا حصول جدید سائنسی ایجادات کے بغیر محال ہے لہٰذا جدید سائنس دینی علمیت کی روشنی میں الحق کی مادی تجسیم ہے

[۹۹] اسلام اور مغرب دو متضاد، مختلف، متصادم، متخالف، مابعد الطبیعیات سے پھوٹنے والی دو مختلف علمیات [Epistomologies] ضرور ہیں لیکن دونوں کے مقاصد اور اہداف ایک ہی ہیں شرف انسانیت کا تحفظ اور انسان کا کائنات کی تمام قوتوں پر ایسا غلبہ جو بحیثیت خلیفہ فی الارض نائب رسول ہونے کے ناتے اس کی بنیادی ذمہ داری ہے ان معنوں میں اصولی طور پر دونوں تہذیبیں بہ ظاہر مختلف متضاد ہونے کے باوجود اصلاً مقاصد میں ایک ہیں لہٰذا اسلام مغرب سے بھرپور اتحاد کرسکتا ہے حدیث ہے حکمت مومن کی متاع گم شدہ ہے اسے جہاں چاہے پالے حدیث ہے علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین جانا پڑے جو بلاشبہ مشرکوں کی سرزمین ہے۔لہٰذا حصول سائنس کے لیے ہر سفر دین کی معرفت کا ہی سفر ہے۔جس سے دنیا بھی بہتر ہوگی اور آخرت میں کامیابی لازم ہے۔

[۱۰۰] عقل اپنی حجیت میں خالص، مطلق، مکمل مگر نقل کے تابع ہونے کے باوجود نقل کے مماثل ہے جس طرح صحابہ رسالت مآب سے فیض حاصل کرنے کے بعد امت کے لیے حجت بن گئے عدالت صحابہ یہی تو ہے لہٰذا وہ مقامات جہاں قرآن وسنت رہنمائی نہیں کرتے وہاں عقل واحد ماخذ علم ہے جو نور ہدایت سے سرفراز ہونے کے بعد آزادانہ تعقل سے رائے قائم کرے گی اسی کو ہم اجتہاد کہتے ہیں یعنی آزادانہ عقلی سرگرمی جو عقل کے معیار پر پورا اترے اور کسی غیر عقلی اثر سے متاثر نہ ہو۔

[۱۰۱] مغرب کے مختلف مناہج علمی مکاتب فکر سے جزواً جزواً استفادہ کرکے افکار کا ایک خوبصورت گلدستہ تیار کرکے پیش کردینا مثلاً اپنے آپ کو جدیدیت پسند ثابت کرنا لیکن یہ نہ بتانا کہ آپ کونسے جدیدیت پسند ہیں، ماڈرنسٹ، پوسٹ ماڈرنسٹ، ٹرانس ماڈرنسٹ، لیٹ

ماڈرنسٹ، کنٹم پرری ماڈرنسٹ، نیو مارکسٹ پوسٹ ماڈرنسٹ، جینالوجیکل پوسٹ ماڈرنسٹ بہت سے مسلم مفکرین خود کو لبرل مفکر کہتے ہیں مگر نہیں بتاتے کہ وہ پیور لبرل ہیں یا اسلامسٹ لبرل یا لبرل اسلامسٹ یا گڈ بیس لبرل، تھیالوجیکل لبرل، اونٹالوجیکل لبرل یا لبریٹرین لبرل یا انارکسٹ لبرل یا فیمنسٹ لبرل ہیں اس سوال کے جواب میں وہ خود کو مسلم حقیقت پسند Muslim Realist کہتے ہیں لیکن ان سے پوچھا جائے کہ کونسے مسلم، مسلم فنڈامینٹلسٹ، مسلم آرتھوڈوکسٹ، مسلم ریوزنسٹ، مسلم ریواؤلسٹ، مسلم اوکسی ڈینٹلسٹ یا مسلم اوریئنٹلسٹ تو ان کو کچھ سمجھ نہیں آتا وہ لوگ جو اپنے مقام کا تعین کرنے سے قاصر ہیں عہد حاضر میں اسلام اور مغرب میں تطبیق و تلفیق کی کوشش کر رہے ہیں ان میں سے بہت سوں کا خیال ہے کہ وہ اسلامی مارکس ازم کے نمائندہ ہیں مگر جب پوچھا جائے پہلے یہ متعین کریں کہ آپ مارکس ازم کے کس مکتب سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً ویسٹرن مارکسٹ، رشین مارکسٹ، لبرل مارکسٹ، یوروپین مارکسٹ، انارکسٹ مارکسٹ، ایسٹرن یوروپین مارکسٹ، مڈل ایسٹرن مارکسٹ، تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا مذہب کے منہاج علمی میں غیر مذہبی منہاج علم سے استفادہ کرنا اور خود کو مذہبی بھی کہنا غیر مذہبی رویہ ہے فلسفہ کی دنیا میں مختلف مناہج و مکاتب فلسفہ سے پھول چن کر گلدستہ بنانا نہایت کم زور ترین فلسفہ کہلاتا ہے اسے اسطفائیت [Eclectcism] کہتے ہیں۔

لغات فلسفہ کے مطابق ایسا فلسفہ جو مختلف فلسفیانہ یا دینیاتی مسائل کو مرکب کرنے کا اصول، عمل یا رجحان ہے، عملی صورت میں اصطفائیت فلسفیانہ نظاموں میں وحدت تلاش کرنے کا نام ہے لیکن عام طور پر یہ رجحان ایسے مفکرین کے یہاں پایا جاتا ہے جن میں ذہنی اپچ کی کمی ہو۔[کشاف اصطلاحات، فلسفہ، ڈاکٹر قاضی عبدالقادر، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی، ص۵۷]

ہمارے جدیدیت پسند طبقات علامہ اقبال کے خطبات اقبال کی طرح اصطفائی فلسفے کے اسیر ہیں اس سے ماورا نہیں ہو سکے علامہ اقبال نے تو الحمدللہ خطبات کے ان مباحث سے رجوع کر لیا تھا جو مسلمہ اسلامی علمیت کے منافی تھے تفصیل کے لیے سہیل عمر کی کتاب

''خطبات اقبال نئے تناظر میں'' کے آخری باب کا آخری پیراگراف اور جریدہ ۳۴، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی میں سید سلیمان ندوی کی خطبات پر تنقید امالی غلام محمد کا مطالعہ کافی رہے گا۔

[۱۰۲] عالم اسلام کے عوام شدت سے دل کی گہرائیوں سے باطن کے اعماق سے روح کی پہنائی سے اسلام چاہتے ہیں لیکن انھیں اسلام سے اپنی چاہت کے اظہار کے مواقع نہیں دیے جارہے، ایک مرتبہ مغرب مسلم دنیا کے آمروں کی سرپرستی کرنا چھوڑ دے اور جبر واستبداد کی حمایت نہ کرے تو پورا عالم اسلام اسلام کے حق میں ووٹ ڈالنے جوق در جوق اور شوق در شوق نکل آئے گا عوام تو اسلام ہی چاہتے ہیں مگر اس خواہش کے اظہار میں مسلمان حکومتوں کے حکمراں رکاوٹ ہیں اس مغالطے کی کوئی تاریخی علمی حقیقی بنیاد نہیں ہے یہ محض مفروضہ ہے اور بعض جدیدیت پسند اپنے تمام تر اخلاص، بے پناہ قربانیوں، ایثار اور شہادتوں کے باوجود گزشتہ سو برس سے اس مفروضے کی بنیاد پر مصروف عمل ہیں ایک مفکر نے تو عیسائیت پر ایک مضمون میں مغرب کو دعوت دی تھی کہ ایک مرتبہ ہمیں آزادی دے دی جائے پھر ہم توہین رسالت کے قانون سے لے کر تمام مغربی اعتراضات پر بات چیت کر سکتے ہیں وہ لکھتے ہیں ''ہمیں یقین ہے کہ ایک دفعہ مسلمان آزاد ہو جائیں اور اہل افراد اس کام کو کریں تو مسلمان کفر وارتداد، توہین رسالت حدود، اقلیتوں کے حقوق اور انسانی حقوق جیسے امور پر دوبارہ غور میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے اس وقت بھی بحث جاری ہے لیکن مذکورہ شرائط پوری نہ ہوں تو یہ بحث اور مشق نتیجہ خیز نہیں ہوگی'' گویا آزادی ترقی، قومی ریاست اس قدر بڑی نعمت ہے کہ قانون توہین رسالت، نصوص صریحہ، حدود وارتداد کی سزا جیسے امور میں اس آزادی کے بدلے ترمیم وتبدیلی کے بارے میں غور وفکر کے دروازے کھولے جاسکتے ہیں۔

[۱۰۳] ماضی کی تمام تہذیبوں اور روایات [Traditions & Civilizations] کا مجموعی رویہ ظاہر کرتا تھا کہ ہر عہد کے لوگ اپنے مقابلے میں گزرے ہوئے دور کو افضل جانتے تھے اور اپنے زمانے کی کوتاہیوں کا شکوہ کرتے تھے یہ رویہ درست نہیں تھا یہ ماضی پرستی ہے پیچھے

دیکھنے والی قوم ترقی کی دوڑ میں کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ زندگی کے ہر شعبے کو دور جدید کے مطابق کرنا ہی درست رویہ ہے لہٰذا دین اسلام کو بھی بیسویں صدی کی روح عصر سے مماثل ثابت کیا جائے۔اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ سابقہ دور کو افضل سمجھنے کا رویہ ترک کر دیا جائے کیونکہ ہر آنے والا دور پچھلے سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔

[۱۰۴] اصل الاصول حرکت ہے: عدم تغیر اسلام کی اساسی صفت ہے جس کے بغیر اس کی تکمیل نہیں ہوتی لیکن عدم تغیر حرکت [Motion] کی ضد ہے اور حرکت زندگی ہے اسلام میں موجود فقہاء وعلماء کا طبقہ اس کو تغیر سے محفوظ رکھتا ہے جو درست رویہ نہیں ہے اسلام خود تغیر کا طالب ہے وہ حرکت، اجتہاد، ترقی کے ذریعے عدم تغیر کا پیغامبر بن جاتا ہے۔

[۱۰۵] قرآن میں دین اور شریعت کی اصطلاحات کا مفہوم ایک نہیں ہے دین الگ شے ہے اور شریعت سے الگ ہے۔شریعتیں وقتی ہیں دین آفاقی ہوتا ہے شریعتیں زمان مکان کی پابند ہیں۔ دین شریعت پر مقدم ہے دین کا تعلق مابعدالطبیعیات سے ہے اور شریعت کا انسان کی اجتماعی زندگی سے۔شریعت کا مقصد سچائی اور انصاف کی بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل ہے۔ شریعت کا تعلق عبادات ومعاملات دونوں سے ہے۔عبادت کا تعلق وحی سے ہے اس لیے ان میں عقل دخل نہیں دیتی۔ دنیاوی امور میں شریعت نے چند رہنما اصول وضع کیے تفصیلات کو عقل پر چھوڑ دیا ہے لہٰذا عقل عبادات کے سوا تمام معاملات کے فیصلے وقت کے تقاضوں کے مطابق خود طے کرتی ہے۔ چونکہ زندگی ایک تغیر پذیر اور نمو پذیر حقیقت ہے لہٰذا زندگی سے متعلق ہر شے کو بھی تغیر پذیر ہونا چاہیے جو چیز زندگی کے ساتھ بدلنے کی شرط کو پورا نہ کرے گی وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے گی اور زندگی س کا ساتھ چھوڑ دے گی زندگی تغیر پذیر ہے لہٰذا شریعت کے قانون کو بھی تغیر پذیر ہونا پڑتا ہے ورنہ دونوں کا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ نیا وقت اپنے ساتھ نئے مسائل لے کر آتا ہے جسے اپنے وقت پر ہی حل ہونا چاہیے شریعت پر اسی غور وفکر سے فقہ اسلامی کا ذخیرہ وجود میں آیا اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے مفاسد کا دروازہ کھلا۔شریعت پر عقل کے اطلاق سے فقہ نکلی اور یہ فقہ ہی شریعت بن کر......عقل کی دشمن ہوگئی حالانکہ فقہ عقل کی تخلیق ہے مگر اپنے خالق کے خلاف ہوگئی۔ قانون یعنی شریعت کا

رشتہ زندگی سے ٹوٹتا گیا اور عارضی عقلی فقہی ظنی احکام کو دوامی حیثیت حاصل ہوگئی اور وہ دین کی مابعد الطبیعیات کی طرح زماں و مکان کی قیود سے بالاتر قرار پائے۔ لہٰذا شریعت تغیر پذیر معاشرے کا ساتھ نہیں دے سکتی جمود و تقلید نے فقہ یعنی شریعت کے خاص عقلی فہم کو ہی اصلی اور حقیقی مطلق فہم میں بدل دیا اس سے تغیر پذیر علم فقہ، حرکی شریعت جامد بن گئی اور بدلتی ہوئی زندگی کا ساتھ دینے سے عاجز ہوگئی لہٰذا مسلمان جو آج بھی شریعت پر عمل کرنا چاہتے ہیں اس متحجر شریعت پر عمل کرنے کے قابل نہیں رہے لہٰذا اسی شریعت نے مسلمانوں کو سیکولر بننے پر مجبور کیا اور دین سے ان کا حرکی رشتہ منقطع کر دیا اور ان کی دین سے وفاداری کو بھی مشکوک بنا دیا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین آدمؑ سے آنحضرتﷺ تک واحد ہے تو دین سے مراد مابعد الطبیعیات یا حقائق غیب ہوتے ہیں لیکن جب ہم یہ فقرہ استعمال کرتے ہیں کہ اسلام ہمارا دین ہے تو اس سے مراد وہ سارے امور ہوتے ہیں جو ہمیں قرآن اور سنت تعامل و اجماع امت احادیث کے ذریعہ حاصل ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں پہلی صورت میں ہم ''دین'' کو صرف عقائد یا مابعد الطبیعیات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جب کہ دوسری صورت میں دین، عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور احکام کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ اسی طرح شریعت کا لفظ بھی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ شریعت کہہ کر ایک معنی میں ہم ''عبادات اور معاملات'' مراد لیتے ہیں اور مابعد الطبیعیات یعنی عقائد کو اس میں شامل نہیں کرتے اور اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ مابعد الطبیعیات تو آدمؑ سے آنحضرتﷺ تک ایک ہے لیکن عبادات اور معاملات کے احکام میں فرق ہے، لیکن دوسرے معنوں میں شریعت کا مفہوم عبادات اور معاملات کے ساتھ مابعد الطبیعیات یا عقائد پر بھی حاوی ہوتا ہے اور ہم عقائد، عبادات اور معاملات سب کو شریعت میں شامل کر لیتے ہیں۔ ایک معنی میں دین اور شریعت کو ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسرے معنی میں شریعت اور دین ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس بحث کے بے شمار مضمرات ہیں جن سے ہمیں فی الحال سروکار نہیں ہے۔ لیکن اس سے غالباً یہ نتیجہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے کہ جب ہم دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا

دین کہتے ہیں تو اس میں مابعد الطبیعیات، عبادات، اخلاقیات و احکام، یعنی عقائد، عبادات اور معاملات سب شامل ہیں اور ان معنوں میں ہمارا دین مکمل ہے اور ناقابل تغیر و تبدل ہے۔ختم نبوت کے عقیدہ کے یہی معنی ہیں کہ اب یہ دین ہی مع اپنی مابعد الطبیعیات اور شریعت کے اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔

''تکمیل دین'' کے ارشادِ ربانی کے بعد سے قیامت تک ایک ہی دین اور ایک ہی شریعت ہے جس پر ہمیں چلتے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ دین و شریعت ان عقائد، عبادات اور معاملات کا مجموعہ ہے جو ہمیں قرآن اور احادیث کے ذریعہ دیا گیا ہے۔

[۱۰۶] عقل کے ذریعے جو اجتہاد کیا جائے گا اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اسلامی معاشرہ اسے قبول کرے اسلامی معاشرے کی اسی قبولیت کو اجماع امت کہتے ہیں چنانچہ قرآن حدیث پر عمل ہوگا ان میں واضح حکم نہ ملے تو عقل ایمانی سے کام لیا جائے گا اور اس بات کا فیصلہ کہ کسی فرد نے جو اجتہاد کیا ہے وہ دین کی روح کے مطابق ہے یا نہیں اسلامی معاشرہ کرے گا۔یہی فقہ کے بنیادی اصول ہیں قرآن حدیث قیاس اور اجماع۔

[۱۰۷] فقہ ان قیاسی یا عقلی اجتہادات پر مشتمل ہے جو ایسے معاملات سے متعلق ہیں جن کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی واضح حکم نہیں ملتا انہیں حسبِ ضرورت تبدیل کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس تبدیلی کو مسلم معاشرہ کی تائید اور منظوری حاصل ہو یہ ایک لازمی شرط ہے کیونکہ اجتہاد ایک فرد کرتا ہے یا چند افراد مل کر جن کی رائے میں غلطی کا امکان ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اسلامی معاشرہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ وہ اجتہاد اس کے نزدیک درست ہے یا نہیں اسلامی معاشرہ وہ معاشرہ ہے جو قرآن وسنت کی عملی شکل ہے اور ان لوگوں پر مشتمل ہے جو عملاً دین کے لیے ایک زندہ نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

[۱۰۸] عوام پر علماء کا اثر جمود اور تقلید کا اصل سبب ہے یہ اثر جب تک کم نہیں ہوگا عوام لبرل ماڈرن نہیں ہوسکتے نہ ترقی کرسکتے ہیں۔اس کا طریقہ وہی ہے جو ترکی میں کمال اتاترک نے اختیار کیا کہ مدارس بند کردیے اور مولویوں کا خاتمہ کرکے عربی زبان اذان ٹوپی داڑھی پر پابندی لگادی یا روس کا تجربہ ہے کہ عربی فارسی رسم الخط ختم کرکے مسلمانوں کو ان کی تاریخ

سے کاٹ دیا گیا یا انڈونیشیا کا تجربہ ہے کہ جہاں از ہر کا اسلام روایتی اسلام کی بیخ کنی کر چکا ہے اور جو اسلام ابھر رہا ہے وہ بالکل مغرب سے ہم آہنگ ہے انڈونیشیا کی سسٹرز آف اسلام کا لٹریچر اس کا ثبوت ہے۔

[۱۰۹] اسلام میں اصول حرکت مرکزی نکتہ ہے اقبال کا خطبہ اجتہاد اسی اصول حرکت کی مذہبی فلسفیانہ تفسیر ہے حرکت وتغیر ہی زندگی کا ابدی اصول ہے موجودہ فقہ اور شریعت حرکت وتغیر کے اصول کو سمونے سے قاصر ہے لہٰذا شریعت لوگوں کے لیے قابل عمل نہیں رہی شریعت کا مقصد حاضر وموجود زندگی سے انسان کو ہم آہنگ کرنا ہے مگر حاضر وموجود نیا زمانہ ہے اور شریعت قدیم زمانہ کی یادگار ہے لہٰذا عہد حاضر کے لیے بالکل بے کار ہے چونکہ زمانہ ہمیشہ آگے بڑھتا ہے پیچھے نہیں لوٹتا پانی بہہ جائے تو اسے لوٹایا نہیں جا سکتا لہٰذا زمانہ کو بدلنے کی کوشش کرنے کے مقابلے میں شریعت کو زمانے کے لحاظ سے بدلنا آسان ہے دین عسر نہیں یسر ہے یسر سے متعلق تمام احادیث کا خلاصہ یہی ہے کہ دین میں سہولت، آسانی پیدا کرو سختی نہ کرو لہٰذا اس حدیث کے تحت عمل کیا جائے۔ اور اسلام کے اصول حرکت کے تحت حرکت پذیر زندگی سے حرکت پذیر شریعت کو ہم آہنگ کر دیا جائے یہی اجتہادی رویہ دین کو مطلوب ہے۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ دین میں حرکت کا تصور کیا ہے کس معنیٰ میں اسلامی عقلمیت منجمد ہے اور کس معنیٰ میں حرکت پذیر ہے اسلامی علمیت کی دوامی حیثیت کے باعث اسے بہتے ہوئے دریا سے تشبیہہ نہیں دی جا سکتی اسے ہم کعبۃ اللہ سے تشبیہہ دے سکتے ہیں جو قائم و دائم اور مستحکم ہے اسے ہم ایک درخت سے تشبیہہ دے سکتے ہیں جس کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں اور جس کی شاخیں آسمان کی طرف ہیں لہٰذا یہ مستقل بھی ہے متحرک بھی۔

جو لوگ دین اور شریعت کو بھی مانتے ہیں اور حرکت وتغیر کے بھی قائل ہیں انھیں پہلے اس سوال کا جواب دینا چاہیے کہ اس ہر آن بدلتی ہوئی زندگی میں ایک ایسی چیز کی کیا ضرورت ہے جو قدم قدم پر اس کی راہ میں رکاوٹ بنے؟ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ مثلاً لا دین مغرب کی طرح یہ موقف اختیار کر لیا جائے کہ چونکہ ہر چیز بدل رہی ہے اس لیے عقل کو یہ آزادی ہے کہ بدلتی

ہوئی صورتِ حال پر آزادانہ غور وفکر کے ذریعہ آزادانہ طور پر اپنے مسائل کا وہ حل لاش کرلے جو اس صورت حال کے مطابق ہو۔

دین وشریعت اور زندگی کے تعلق سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے حرکت وتغیر کو سمجھ لیں۔ حرکت وتغیر کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز کچھ ہے اور کچھ بن رہی ہے اور جو وہ بن رہی ہے وہ اس سے مختلف ہے۔اس لیے بقول اقبال حرکت کے معنی ہیں جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا۔زیادہ واضح لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو متحرک اور متغیر ہے ہر آن اپنی اصل سے دور جارہی ہے۔اب اگر یہ حرکت وتغیر ہی زندگی کا واحد اصول ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر قائم نہ رہے اور تغیر کے سوا کسی چیز کو ثبات نہ ہو۔صاف لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ دین وشریعت اول تو زندگی کے تغیر وحرکت سے ٹکرا کر فنا ہوجائیں اور اگر انھیں کسی طرح زندگی کی طرح متحرک بنالیا جائے تو ہر آن بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ خود بھی بدلتے رہیں۔ یہاں تک کہ بدلتے بدلتے کچھ سے کچھ بن جائیں مگر بظاہر ان دو نتیجوں کے سوا اور کوئی تیسرا نتیجہ ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ جو لوگ زندگی کے تغیر اور حرکت کے حوالے سے بات کرتے ہیں انھیں دین وشریعت کا ہر جز وزندگی کی حرکت کو روکتا ہوا معلوم ہوتا ہے ان میں سے بعض فقہ کو حرکت میں مزاحم سمجھتے ہیں بعض حدیث کو کچھ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک قرآن پورا کا پورا دائمی نہیں ہے،اس کے بھی کچھ اجزا دائمی اور کچھ عارضی ہیں اور ایک گروہ ایسے لوگوں کا موجود ہے جو ان سب چیزوں کو بھی قابل تغیر سمجھتا ہے اور جس کے نزدیک صرف ایک مذہب کا برقرار رہنا ہی کافی ہے۔

زندگی بے شک حرکت اور تغیر کی حالت میں ہے لیکن اس کی حرکت اسے ''اصل'' یا مرکز سے دُور لے جاتی ہے۔ دوسری حرکت اسے اصل یا مرکز کی طرف واپس بلاتی ہے۔ پہلی حرکت ''مرکز گریز'' ہوتی ہے دوسری حرکت ''مرکز جُو''۔ چنانچہ زندگی تبدیل بھی ہوتی رہتی ہے اور اپنی اصل کی طرف لوٹتی بھی رہتی ہے۔اب اسے دین اور شریعت کے حوالے سے سمجھیے تو معلوم ہوگا کہ زندگی ہر آن ایسے مسائل پیدا کرتی ہے جو لوگوں کو دین اور شریعت سے دُور لے جاتے ہیں۔اگر وہ اسی رخ چلتے رہیں تو یقیناً دین وشریعت ختم ہو کر رہ جائیں لیکن

چونکہ دوسری حرکت ''مرکزجُو'' حرکت ہے اس لیے ان کی زندگی پھر دین وشریعت کی اصل کی طرف لوٹتی ہے اور اصل کی طرف لوٹنے کا یہی عمل تجدید کہلاتا ہے۔ تجدد تبدیلی اور تغیر کے نام پر دین وشریعت سے دور جانے کا عمل ہے۔ تجدید اس تبدیلی اور تغیر میں دین وشریعت کی طرف لوٹنے کا عمل ہے چنانچہ مجدد اسے کہتے ہیں جو بدلتے ہوئے حالات میں زندگی کا رخ پھر دین وشریعت کی اصل کی طرف موڑ دے۔

تقلید کا اصول اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے مسلم معاشرہ اپنی صورت پذیری میں جس قسم کے امکانات اپنے اندر رکھتا ہے وہ ظاہر ہو چکے ہیں اور ضرورت یہ ہے کہ مسلم معاشرہ کی ظاہر شدہ شکل کی حفاظت کی جائے۔ چونکہ یہ بات بہت غور طلب ہے اس لیے اسے ایک اور طرح سمجھیے۔ حرکت کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز اپنے نکتۂ آغاز، اپنی اصل یا اپنے سرچشمہ سے دور جا رہی ہے۔ یہ حرکت ایک حد تک اس کے وجود کی توسیع کے لیے ضروری ہوتی ہے لیکن اگر یہ حرکت مسلسل جاری رہے تو وہ چیز اپنی اصل سے اتنی دور ہو جائے گی کہ اس کی ماہیت ہی بدل جائے گی۔ اس لیے فطرت عمل اور ردعمل حرکت اور سکون آگے بڑھنے اور واپس آنے کے دوگونہ عمل کو ظاہر کرتی ہے۔ اور ان کے درمیان توازن قائم رکھتی ہے۔ مسلم معاشرہ میں وہ وقت صدیوں پہلے آ چکا تھا کہ اگر حرکت کرنے سے نہ روکا جاتا تو مسلم معاشرہ اپنی اصل سے اتنی دور ہو جاتا کہ وہ مسلم معاشرہ نہ رہتا۔ تقلید سلف وآثار کا اصول اسی وقت اختیار کیا گیا اور اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ اجتہاد کے نام پر مسلم معاشرہ میں ایسے عناصر کو جذب کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں جن کے بارے میں ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ وہ مسلم معاشرہ کی ماہیت کو ہی تبدیل کر دیں گے۔

تقلید سلف اگر اتنی ہی غیر فطری چیز ہے تو ''ہر آن بدلتی ہوئی زندگی'' میں اس کا امکان کیسے پیدا ہوا۔ اور صدیوں تک دوڑتی بھاگتی زندگی اس کے اثر سے پاؤں توڑ کر کیوں بیٹھ گئی۔ دونوں میں تضاد اور تصادم کیوں نہیں پیدا ہوا اور زندگی نے دو چار دس بیس سال نہیں صدیوں تک تقلید جامد کے طوق کو زیب گلو کیوں بنائے رکھا۔ معاف کیجیے ہم یہ سوال تفنن کے طور پر نہیں کر رہے ہیں ان کے پیچھے فکر وخیال کے سنگین ترین مسائل پوشیدہ ہیں۔

آخر یہ کیا بات ہے کہ صدیوں تک تقلید جامد ہمارے مسائل حل کرتی رہی اور اب اچانک سوال، مسائل، الجھنیں، پیچیدگیاں ہم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں کہ نہ فقہ سے حل ہوتی ہیں۔ نہ حدیث سے نہ قرآن سے اور ہم میں ہزاروں لاکھوں انسان ایسے پیدا ہوگئے ہیں جن کا مذہب ایک فرسودہ از کارِ رفتہ چیز بن گیا ہے اور جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مذہب کا دور ہمیشہ کے لیے گذر چکا ہے!

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہیے کہ دین وشریعت کی مثال ایک بیج کی ہے۔ بیج میں پورا درخت اپنی شاخوں، پتوں اور پھولوں کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور اسے بیج سے نکلنے اور برومند ہونے تک ایک وقت درکار ہوتا ہے۔ لیکن جب درخت پورا ہوجاتا ہے تو پھر اس کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ اسے قائم رکھا جاتا ہے اور اس کی زندگی اس بات میں ہوتی ہے کہ اسے برقرار رکھا جائے تاکہ وہ نئے نئے موسموں میں نئے نئے پھل دیتا رہے۔ اس کے سوا جو طریقہ ہے وہ غیر فطری ہے۔ دین وشریعت کے لیے بھی اپنے ساری ظاہری امکانات کو بروئے کار لانے کے ایک وقت درکار ہوتا ہے لیکن جب خارجی طور پر سارے امکانات ظاہر ہوجاتے ہیں تو پھر ضروری ہوتا ہے کہ اس نے جس شکل اور جسم میں اپنا اظہار کیا ہے اسے باقی رکھا جائے اور اس کی تندرستی اور توانائی کو قائم رکھا جائے۔

سوال یہ ہے کہ ایک تقلیدی معاشرہ میں اچانک اتنے سوال اور مسائل کیسے پیدا ہوئے کہ اجتہاد کا دروازہ دوبارہ کھولے بغیر ان کو حل نہ کیا جاسکے۔ یقیناً اس سوال کا جواب یہ نہیں ہے کہ یہ سوال ''زندگی'' کے پیدا کیے ہوئے ہیں کیوں کہ زندگی ان تغیر پذیر فطرت کے ساتھ ان صدیوں میں بھی موجود تھی جو تقلید کا شکار تھیں۔ یہ مسائل زندگی کے پیدا کیے ہوتے تو یہ ان صدیوں میں بھی موجود ہوتے۔ دراصل اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ یہ مسائل زندگی کی تبدیلیوں نے پیدا کیے ہیں بلکہ اس کا جواب کچھ اور ہے جس پر ہم نے کبھی غور نہیں کیا۔ اس ''کچھ اور'' کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ تبدیلی کی دو قسموں کا ذکر کیا جائے۔ ایک تبدیلی تو وہ ہے جو کسی چیز میں اس کے اندرونی تقاضے سے پید ہوتی ہے اور ایک تبدیلی وہ ہے جو کسی بیرونی دباؤ اثر یا عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان دو تبدیلیوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

وہ تبدیلی جو زندگی پیدا کرتی ہے پہلی قسم کی تبدیلی ہوتی ہے لیکن دوسری قسم کی تبدیلی قطعاً خارجی مصنوعی اور غیر فطری ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں اب جو تبدیلی آرہی ہے وہ ایسی نہیں ہے جو اس کے اندرونی تقاضے اور اس کی اپنی توانائی بخش زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جو خارجی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ یہ تبدیلی ہمارے معاشرے میں از خود نہیں پیدا ہورہی ہے ۔ اس تبدیلی کا سبب ہمارے معاشرے میں ''مغرب'' کے اثرات کی مداخلت ہے۔ یہ تبدیلیاں اس لیے پیدا ہورہی ہیں کہ ایک قطعی اجنبی، ناپسندیدہ، اور تباہ کن قوت اسے خارج سے ہمارے اندر ڈال رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ تبدیلی ہمارے یہاں اس وقت شروع ہوئی جب انگریز ہمارے معاشرے میں دخیل ہوئے، چنانچہ یہ تبدیلی سراسر ایک ایسی تبدیلی ہے جو ہمارے معاشرہ کی روح اور جسم دونوں سے متصادم ہے۔ ہمارے اندر یہ تبدیلی جتنی جذب ہوتی جائے گی اور ہم اس کے اثرات کو جتنا اپنے اندر قبول کرتے جائیں گے ہمارے معاشرہ کی روح اور جسم دونوں تباہی کی زد میں آتے جائیں گے۔ جو لوگ اسے زندگی کی تبدیلی کہتے ہیں انھیں سوچنا چاہیے کہ کیا مغرب کے اثر کے بغیر ہمارا معاشرہ وہ بن سکتا تھا جو وہ اب بن رہا ہے؟

تبدیلی کی موجودہ صورتِ حال میں تبدیلیوں کے سیل رواں کو دین میں سمو لینے اور عہد حاضر کی بے ربط وسعت کو اسلام کاری کے ذریعے اسلام کی توسیع کا نام دینے کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھولنے کے صرف ایک معنی ہیں۔ مغرب کے اثرات کا دروازہ کھولنا۔ دراصل جو لوگ اجتہاد، کا نعرہ لگا رہے ہیں وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہتے کہ مغرب سے جو اثر ہمارے اندر داخل ہورہے ہیں اور ان سے جو مسائل اور سوال پیدا ہورہے ہیں انھیں کس طرح اسلامی جواز کی سند دے دی جائے اور کس طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ اسلام انھیں قبول کرنے یا اپنے اندر جذب کرنے میں مانع نہیں ہے۔ جدیدیت پسند مفکرین جن شاذ آراء، تفردات پیش کرنے کے لیے جن علمائے ربانی کا ذکر بار بار کرتے ہیں ان سب کی فکر کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ کس طرح مغرب کے اثرات کو اپنے معاشرہ میں جذب کیا جائے۔ اس کے لیے وہ بڑے بڑے خوش نما لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ترقی، خوش حالی، روشن خیالی،

نشاۃ ثانیہ مگران سب لفظوں کے صرف ایک ٹھوس معنی ہیں، مغربیت!
مسلم معاشرہ کے سامنے مثالی نمونہ صرف ایک ہے۔ عہد رسالت ؐ کا معاشرہ۔ اجتہاد اور تجدید کے معنی اگر یہ ہیں کہ مسلم معاشرہ کو اس مثالی معاشرہ کے مطابق بنایا جائے تو بے شک یہ ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے لیکن اگر اجتہاد اور تجدید کا مطلب کسی ایسے معاشرہ کی طرف بڑھنا ہے جو اسلام کے مثالی معاشرہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو یا ہمیں اس سے مختلف بناتا ہو یا جس میں کوئی ایسی چیز ہو جو اس مثالی معاشرہ سے تصادم کی حالت میں ہو تو یہ اجتہاد اور تجدید کارِ شیطانی ہے اور ہر مسلمان کو اس سے پناہ مانگنی چاہیے۔

[۱۱۰] قرآن پورے کا پورا دائمی نہیں ہے اس کے بھی کچھ اجزاء دائمی ہیں اور کچھ عارضی ہیں اس کا فیصلہ عقل انسانی، حالات، ضروریات، مصلحت، وقت کے تقاضے، زمانے کی رفتار، زمینی حقائق، حکمت عملی کرے گی۔

[۱۱۱] تقلید کا اصول ص ۴۸ سیر وسفر ہمارا سے کتابت ہوگا۔ (اس کا جواب ۴۸، ۴۹ پر ہے) یہ درست ہے کہ غیر فطری تقلید ہر آن بدلتی دوڑتی بھاگتی زندگی کا ساتھ دیتی رہی اور صدیوں تک دوڑتی ہوئی زندگی اس کے اثر سے پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھ گئی دونوں میں تضاد و تصادم پیدا نہیں ہوا دو چار دس سال نہیں صدیوں تک تقلید بیماری میں افاقہ مشکلات و مسائل کا ازالہ و امالہ پیش کرتی رہی لیکن اٹھارہویں صدی میں Great Transformation اور Glorious Revolution کے بعد عقلی علوم کی رفتار اتنی تیز ہوگئی کہ پوری تاریخ انسانی نے ایسا منظر نہیں دیکھا مثلاً زمین ساکن ہے کا نظریہ دو ہزار سال تک مذہب فلسفے سائنس کی دنیا میں متفق علیہ رہا لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہر سائنسی نظریہ چند مہینوں، سالوں میں بدل جاتا ہے عقلی علوم کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ ماضی میں جو علوم منظر عام پر آنے کے لیے چار سو سال کا عرصہ لیتے تھے اب وہ دس پندرہ سال میں قصۂ شہود پر آجاتے ہیں لہٰذا اس قدر تیز رفتار زندگی کے لیے اس سے زیادہ تیز رفتار شریعت کی ضرورت ہے قدیم فقہ اس تیز رفتاری میں کچلی جائے گی۔

[۱۱۲] ص ۵۰ سیر وسفر ہمارا کتابت ہوگا

[۱۱۳] جامد مذہبیت کی وزنی دلیل صرف یہ ہے کہ تبدیلی کی موجودہ صورت حال میں اجتہاد کا دروازہ کھولنے کے صرف ایک معنی ہیں مغرب کے اثرات کا دروازہ کھولنا مغرب سے جو اثرات ہمارے اندر داخل ہورہے ہیں ان سے جو مسائل وسوال پیدا ہورہے ہیں ان کو کسی طرح اسلامی جواز کی سند دی جائے اور ثابت کیا جائے کہ اسلام انہیں قبول کرنے یا اپنے اندر جذب کرنے میں مانع نہیں ہے عصری اجتہاد یہی ہے کہ کسی طرح مغرب کے اثرات کو اپنے معاشرے میں جذب کرلیا جائے ترقی، خوش حالی، روشن خیالی، نشاۃ ثانیہ، یعنی مغربیت کو اسلامیانے کا نام اجتہاد ہے۔ یہ الزامات بہ ظاہر ٹھوس ہیں مگر بنیادی سوال یہ ہے کہ شریعت اور فقہ مغرب کے اثرات کو روکنے کے لیے کیا امکانات پیش کرتی ہیں اس سے بچنے کے لیے کیا حکمت عملی بتاتی ہے؟ اگر اس کے پاس ان اثرات کو روکنے کا کوئی نظام، طریقہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے تو کیا صرف حرام مکروہ کہہ دینے سے مسئلہ حل ہوجائے گا اپنی نسلوں کا ایمان محفوظ رکھنے کے لیے حفاظتی طریقہ یہ ہے کہ اس بات کا اعتراف کرلیا جائے کہ ہم مغرب کی یلغار کا مقابلہ نہیں کرسکتے اس یلغار سے آنے والی تبدیلیاں فطری اور تاریخ کا تقاضہ ہیں اسلام دین فطرت ہے لہٰذا وہ عہد حاضر میں فطرت کے مطالبات سے کیسے منہ موڑ سکتا ہے۔ ماضی کے مقابلے میں فرق صرف یہ ہوا ہے کہ پہلے تبدیلی کا عمل فطری تبدیلیاں اندرونی تقاضوں سے پیدا ہوتی تھیں یعنی دنیا پر حاکمیت ہماری تھی اب حاکمیت ہماری نہیں ہے تو بیرونی تقاضے تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں لہٰذا جب تک دنیا پر خلافت اسلامیہ قائم نہیں ہو جاتی اضطراری حالت کے تحت عہد حاضر میں جینے کے لیے اجتہادی رویہ اختیار کرلیا جائے یہ عذر ہے امر مجبوری ہے تاریخ کا جبر ہے روح عصر ہے ہم اسے نظر انداز نہیں کرسکتے۔

جواب ص ۱۵۱ پر ہے سیر وسفر ہمارا

[۱۱۴] ڈاکٹر علی شریعتی نے اشتراکی نظریات کو علوی شیعیت اور صفوی شیعیت کی اصطلاحات کی مدد سے اسلامی قالب دیا اور دین کی تعبیر اور تاریخ کی تفسیر طبقاتی کشمکش اور معاشی جدلیات کے سیاق وسباق میں کی ہے اس قسم کی تفسیر عہد حاضر کے جدید مسلم سیکولر ذہن کو بہت متاثر

کرتی ہے اصلاً یہ طریقہ شریعتی کا نہیں علامہ اقبال کا ہے۔انہوں نے خطبات اقبال میں عصری جدید سائنسی، عقلیت پرستی تجربیت پسندی اور حسیت سے محبت رکھنے والے جدید ذہن کو اسلام کے دائرے میں لانے کے لیے اختیار کیا تھا ہر عہد کی ایک زبان ہوتی ہے عصر حاضر کی زبان، محاورہ یا تو لبرل ازم کے آدرش ہیں یا سوشلزم کے نظریات اسلام کو جدید لسانی ڈھانچوں اور نظریاتی سانچوں کی اصطلاحات میں گفتگو کر کے اپنا مقدمہ پیش کرنا چاہیے کہ وہ عصری ذہن کے لیے قابل تفہیم ہو۔اصطلاحات مغرب کی ہوں پیمانے ان کے ہوں لیکن ان میں شراب ہماری ہو تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔

[۱۱۵] قرآن سے مستفاد کوئی مخصوص علم وجود ontology اور کوئی مخصوص علم کونیات Cosmology حتمی اور دیر پا نہیں ہے بلکہ مختلف علم وجود اور علم کون ہو سکتے ہیں جن کا انحصار مختلف نخبات معاشرہ کے تمدن پر ہوگا قرآن کے پیش نظر ایک مخصوص معاشرہ ہے جو کسی خاص وجودی یا مابعد الطبعیاتی نظام کو مستلزم نہیں ہے چند اقدار ہیں جو اگر کسی معاشرہ کو حاصل ہو جائیں تو کتاب اللہ کے مقاصد پورے ہو جاتے ہیں اسی لیے قرآن میں سماجی احکامات اور مابعد الطبعیاتی اصطلاحات کی تفصیل موجود نہیں ہے۔

[۱۱۶] قرآن کا اپنا فلسفہ بھی ہے اسلام کی فکری تاریخ میں جو مابعد الطبیعیاتی نظریات اس سے منسوب رہے انہیں قرآنی فلسفے کے مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا گو ہم انھیں قرآن کے بارے میں فلسفہ کہہ سکتے ہیں۔

[۱۱۷] قرآن کا بنیادی مقصد ہدایت دینا ہے یہی فہم قرآن کی کلید ہے قرآن کے ہر بیان کو اس کی روشنی میں دیکھنا ہوگا اس ہدایت کی بنیاد فہم عامہ پر ہے لہٰذا قرآن کے ہر بیان کی صداقت اس کے معنیٰ اطلاقات اور مدلولات جاننے کے لیے ہر بیان کا تصوراتی سیاق وسباق کے اس اصول کو سمجھ لیا جائے تو قرآن میں پائی جانے والی بظاہر متضاد باتیں قابل فہم اور حقیقی انسانی احوال وظروف میں بھی حل ہو جاتی ہیں۔

[۱۱۸] جدید انسان عبادت کے مخصوص طریقوں نماز وغیرہ سے بے اطمینانی کا شکار ہے اسے سکون حاصل نہیں عبادت میں جی نہیں لگتا ویسے بھی عبادت کا مقصد خدا کی یاد، آخرت کی یاد دہانی

اور تزکیہ وتطہیر نفس ہے عبادت ذکر الٰہی ہے تو ذکر کی مخصوص صورت پر اصرار کی کوئی وجہ نہیں
قرآن میں ذکر دائمی اور ذکر کثیر کا حکم ہے اس کا جواب اسمائے الہیہ میں مل جاتا ہے ان کے
استعمال سے عبادات منصوصہ سے پیدا ہونے والا توحش دور ہوسکتا ہے نیز ذکر کثیر کے حکم کی
تعمیل بھی ہو جاتی ہے سائنسی علوم اور سطحی خارجی معلومات سے اکتا کر لوگ داخل کی طرف
راغب ہو رہے ہیں اپنے آپ کی تلاش میں ہیں اپنی ذات سے رابطہ، ذکر، اذکار، اعتکاف،
غور وفکر، مراقبہ وغیرہ سب معرفت رب کے منصوص ذرائع ہی ہیں کسی ایک ذریعے کو دوسرے
پر فوقیت دینا یا کمتر سمجھنا مناسب نہیں۔

[۱۱۹] اجتہاد کا مطلب نئی بات بھی ہے جدیدیت کا مطلب بھی کچھ نیا ہے ہم علماء سے اجتہاد کا
مطالبہ اس بنیاد پر نہیں کرتے کہ علماء مسائل وقت کا جواب دینے سے قاصر ہیں اصل مسئلہ یہ
ہے کہ علماء جواب تو دے رہے ہیں مگر وہ جواب عہد حاضر کی نسل کے فکری رجحانات سے
مطابقت نہیں رکھتے اور نفس انسانی پر گراں اور عُسر کا راستہ ہے جس کی حدیث میں ممانعت کی
گئی ہے اجتہاد سے ہماری مراد ہے مناسب موثر قابل عمل قابل اطلاق اجتہاد نہ کہ وہ اجتہاد
جو صرف کاغذ پر سیاہ قلم سے لکھا جائے اور تاریخ کے دفتر میں قید ہو جائے اجتہاد وہ جو زندگی کی
طرح رواں دواں رہے۔ جو اجتہاد اس عہد میں قابل عمل نہیں ہے وہ اصلاً محض عقلی علمی
سرگرمی ہے جس کا صحیح مقام تاریخ کا کوڑے دان ہے۔

[۱۲۰] دین کو جانچنے کا طریقہ کہ دین زندہ ہے یا نہیں اس کا صحیح معیار یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ کیا دین
آج بھی انسانوں کو ایک ایسا قابل عمل وسیلہ فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے وہ دوبارہ اپنے
مبداء ربانی سے مربوط ہوسکیں تو حقیقت یہ ہے کہ نظام عبادات عہد حاضر کے مصروف ترین
انسان کے لیے موثر اور قابل عمل نہیں ہے لہٰذا عبادات کے وہ طریقے بتانا ضروری ہے جو اس
کی معاش و معاد سے ہی متعلق ہوں سائنس اور آثار کائنات کا مشاہدہ اس عبادت کے
امکانات پیدا کرتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عبادات سے انکار کر دیا جائے بلکہ عبادات
کے ساتھ ساتھ عصری طریقوں کو بھی استعمال کیا جائے۔ رب ادخلنی فی بحر احد تیك
اس دعا کا کیا مطلب ہے بحر لامحدود سے دانش کی وحی ایک جوار بھاٹے کی بڑی لہر کی طرح

بہتی ہوئی ہماری محدود دنیا کے ساحلوں تک آ جاتی ہے عقل پیغمبر باطن ہی تو ہے جو علم اور عمل اور طریقہ کار کی امواج میں سے کسی ایک موج کے جزر کے ذریعے ہمیں ابدی اور لامحدود منبع تک واپس پہنچانے کو ممکن بناتی ہے۔

[۱۲۱] اقلیم روحانی سے اقلیم ربانی میں داخل ہونے ''جیون مکتی'' یا مقام کبریٰ کو پانے کا سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ ایک موحد مسلم نفس کے مغالطے مطالبے اور تقاضے تربیت یافتہ عقل یعنی عقل روحانی کی روشنی میں رد کردے اس کے لیے فقہ کے وسیع تر دفتر پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں۔

[۱۲۲] قدیم کہاوتیں ہیں ملکوت ربانی تمہارے اندر ہے تلاش کرو حاصل کرلو گے دستک دو دروازہ تمہارے لیے کھول دیا جائے گا مگر تلاش کرنے کا راستہ دریافت کرنے یا دستک دینے کے فن سیکھنے کے لیے کسی عالم مدرسے مکتب کی ضرورت ہے؟ کیا فطرت قدرت اور ارد گرد کی دنیا خود عالم مکتب مدرسہ نہیں ہے فقہ تمام فطری مکاتب، فطری علماء اور فطری مدارس سے انسان کو کاٹ کر حلال و حرام کی تنگ نائے میں محصور کر دیتی ہے اس کا مقصد اوامر و نواہی کا انکار نہیں بلکہ یہ کہنا ہے کہ معاملات کو صرف حرام و حلال کے پیمانوں سے دیکھنا دین کی جمالیات، داخلیت، حسن، حلاوت، لذت کو ختم کر دیتا ہے اور اسے محض ایک جلاد بنا دیتا ہے جس کے ہاتھ میں شمشیر براں ہمیشہ چمکتی رہتی ہے۔ دین سراپا رحمت ہے اسے رحمت کی صورت میں نظر بھی آنا چاہیے۔

[۱۲۳] مغرب میں پھیلنے والے مخفی علوم، اسرار و رموز، ہندوؤں کے علوم، بدھ تعلقات، مشرق بعید کے نظریات اور تصوف وغیرہ انسان کے داخل کو تلاش کرنے کی مختلف کوششیں ہیں جب خارجیت حد سے زیادہ بڑھ جائے تو انسان داخل کی طرف رجوع کرتا ہے روایتی اسلام میں فقہ، شریعت علم کلام انسان کے داخل سے ہم کلام نہیں ہوتا لہٰذا کلام ربی قلب انسانی پر کوئی اثر مرتب نہیں کرتا دین کی داخلی جہت کو روشن کرنا عہد حاضر کا تقاضہ ہے قدیم روایتی اسلام اس جہت کے بارے میں کورا ہے۔ داخلی جہت کو روشن کرنے کا طریقہ سائنس کے ذریعے آثار کائنات کا مطالعہ اور خالق کائنات کی حمد و ثناء ہے۔

[۱۲۴] اہل عرفان کے طبقات میں اپنے رب کا عارف اور اپنے آپ کا عارف اپنے آپ کو جاننے والا اپنے رب کو جاننے والے سے عرفان میں بڑھا ہوا ہے ذات انسانی ذات خداوندی کی تخلیق ہے جو اس بحر بے کراں کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے لیکن یہ قطرہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو تو یہ دجلہ ہے ۔عہد حاضر کے دجل نے انسان کو قطرہ سے دجلہ اور دریا بننے کے امکانات معدوم کر دیے ہیں روایتی فقہی اسلام ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتا لہٰذا نئے تصوف کی ضرورت ہے جو سائنس اور طبیعیات سے مستفاد ہو۔

[۱۲۵] کوئی شے ایسی نہیں جو دین سے غیر متعلق ہو اس لیے کہ کوئی شے ایسی نہیں جو خدا سے غیر متعلق ہو عہد حاضر کے تمام عقلی علوم ہمیں خدا سے ملا سکتے ہیں مگر مذہب ان کے حصول میں ابھی تک رکاوٹ ہے وہ انھیں تلچھٹ تصور کرتا ہے کمتر علوم ۔ان علوم کو وحی پر فوقیت تو نہیں دی جاسکتی لیکن وحی کے مساوی تو لایا جاسکتا ہے یہ اجتہاد ہو جائے تو دین کا فہم کسی کے لیے صرف خواب نہیں رہے گا۔عامی و عالم عارف و جاہل سب دین کے چشمے سے سیراب ہو سکیں گے۔

[۱۲۶] ایک عالم اصغر ہے جو حاضر و موجود ہے ایک عالم اکبر ہے جو محسوس ہونے کے باوجود غیر موجود ہے عالم اصغر ہی عالم اکبر کا دریچہ ہے۔لیکن روایتی اسلام نے عالم اکبر کے علم کو کبیر اور عالم اصغر کے علم کو صغیر قرار دیا ہے یہ ڈیکارٹ کا نظریہ ثنویت Dualism ہے۔اس کے نتیجے میں عالم اسلام کی علمیت میں علم اپنی وحدت سے کٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا :(۱) مقدس علم نقل کا علم آخرت کا علم [Sacred Knowledge]۔(۲) غیر مقدس عقل کا علم اس دنیا کا علم [Profane Knowledge] اس تقسیم نے اسلام کو سیکولر بنا دیا۔علوم کی یہ تقسیم ٹھیک نہیں ہے عالم اصغر اکبر سے پہلے ہے لہٰذا اس کا علم بھی کبیر بلکہ علم کبریٰ ہے عالم اسلام جب تک عقلی علوم کو نقلی علوم کے مساوی تسلیم نہیں کرے گا ترقی نہیں کر سکتا۔

[۱۲۷] جدیدیت پسندوں کے اکثر دلائل سرسید احمد خان سے ماخوذ ہوتے ہیں مگر وہ سرسید کا حوالہ نہیں دیتے کہ وہ علماء کے طبقے میں زندیق سمجھے جاتے ہیں الطاف حسین حالی نے حیات جاوید کے دوسرے حصے میں سرسید کے تمام تفردات، بدعات اور معتزلہ کے فکر سے سرقہ کردہ

افکار کا خلاصہ جمع کر دیا ہے جو ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں:

حالی نے حصہ دوم کے ص ۲۵۴ پر عقلی دلائل کے ذیل میں ایک مفروضہ قائم کیا ہے وہ پڑھیے:

اسلام نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اس کے لیے زہد و تقدس کی نہیں بلکہ عقل اور استنبازی کی ضرورت تھی جس کی نسبت عمر فاروقؓ نے فرمایا ہے کہ ''**لا تنظرو ا الی صلوٰۃ امری و لا صیامه ولکن انظر وا الی عقله و صدقه**'' (یعنی کسی کے نماز روزہ پر نظر نہ کرو بلکہ اس کی عقل اور سچائی کو دیکھو)

سر سید نے جن مسائل میں علمای سلف سے اختلاف کیا ہے وہ دو قسم کے مسائل ہیں ایک وہ جن میں جمہوری علمائی اہل سنت ان کے خلاف ہیں مگر محققین اہل اسلام میں سے اور لوگ بھی اس طرف گئے ہیں دوسرے وہ جنہیں سر سید بظاہر متفرد معلوم ہوتے ہیں اور یہ دوسری قسم کے اختلافات زیادہ تر قرآن کی تفسیر کے ساتھ مخصوص ہیں۔

دونوں قسم کے مذکورہ بالا اختلافات کا منشا محض یہ تھا کہ آج کل جو اعتراضات اسلام پر مخالفین اسلام کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں یا جو شکوک و شبہات تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں ان کو رفع کیا جائے۔ان کا مقصد کوئی نیا فرق قائم کرنا نہ تھا اس کے بعد حالی سر سید کے انحرافات، بدعات، اختراعات، کو علم کلام کے احیاء کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کلامی دلائل سے اسلام کو فائدہ ہوا گو کہ یہ جمہور اور اجماع کے دلائل کے مخالف تھے لہٰذا افادہ پرستی کے فلسفے کے تحت ان کا جائزہ لیا جائے کہ ان سے جدید اذہان کے شکوک رفع ہوئے یا نہیں۔

اگر چہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر مسئلہ مختلف فیہ کی نسبت جو کچھ سر سید نے لکھا ہے وہی صحیح ہے اور ہر ایک اختلاف میں انھیں کی رائے صائب ہو لیکن چونکہ انھوں نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی ہے اس لیے جو لوگ دین اسلام کے دوست ہیں اور اس کو ہر قسم کے اعتراضات اور شکوک و شبہات سے پاک جانتے ہیں ان سے امید ہے کہ وہ علماء جنھوں نے اختلافات کو صرف اس نظر سے کہ وہ جمہور علمائے اہل سنت کے خلاف ہیں نا قابل التفات سمجھیں گے بلکہ ہر ایک اختلاف پر جو دلائل سر سید نے قائم

کیے ہیں ان پر نہایت بے تعصبی اور انصاف کے ساتھ غور کریں گے۔ان کا فرض ہے کہ ہر ایک مسئلہ مختلف فیہ کے متعلق اول اس بات پر غور کریں کہ جس اعتراض یا شبہہ کے رفع کرنے کی غرض سے انھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے یا فی الواقع اس قابل ہے یا نہیں کہ اس کو رفع کیا جائے، دوسرے یہ کہ جمہور سے اختلاف کیے بغیر وہ اعتراض یا شبہ رفع ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تیسرے جس طریقہ سے سرسید نے اس کو رفع کرنا چاہا ہے اس طریقہ سے اس کا رفع ہونا ممکن ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ اگر ان تینوں باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے گا تو اسلام کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہونگے۔

اس وقت تمام علمی دنیا میں مذہب کی صداقت کا معیار یہ امر قرار پایا ہے کہ جو مذہب حقائق موجودات اور اصول تمدن کے برخلاف ہو وہ مذہب سچا نہیں ہوسکتا۔اس معیار نے جو نتائج مذاہب کے حق میں پیدا کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام قومیں جو علمی اور تمدنی ترقی کی طرف متوجہ ہوئی ہیں وہ سب رفتہ رفتہ مذہب سے وابستہ بردار ہوتی جاتی ہیں۔

عیسائیوں نے بائبل کو اُٹھا کر بالای طاق رکھ دیا ہے اور فی الواقع اگر وہ بائبل کے احکام یا نصیحتوں پر کار بن دہوتے تو ترقی کے میدان میں ان کا قدم رکھنا ناممکن تھا، برہم سماج والوں نے ویدوں میں سے فقط ڈھائی انچھر پریم کے لیے ہیں اور باق کو بالکل خیر باد کہہ دیا ہے۔ آریہ سماج والے ویدوں کا جو مطلب بیان کرتے ہیں اس کو نہ سناتن دھرم کے ہندو تسلیم کرتے ہیں اور نہ یوروپ کے بڑے بڑے سنسکرت دان اور وید کے محقق صحیح جانتے ہیں۔ پس درحقیقت انہوں نے بھی وید سے اپنے تئیں آزاد کرلیا ہے۔سرسید کا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا میں جتنی کتابیں آج الہامی مانی جاتی ہیں ان میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں نہ کوئی چیز حقائق موجودات کے خلاف ہے اور نہ تمدن اور حسن معاشرت کی مانع، پس مسلمان عالموں کا اس بات پر غور کرنا کہ جو کچھ سرسید نے اسلام کی حمایت کی غرض سے لکھا ہے اس کی اس زمانہ میں فی والواقع ضرورت تھی یا نہیں اگر تھی تو سید کی تحریرات سے وہ ضرورت رفع ہوتی ہے یا نہیں؟ کچھ کم ضروری نہیں ہے۔

(۱) اجماع حجت شرعی نہیں ہیں، (۲) قیاس حجت شرعی نہیں ہے، (۳) تقلید واجب نہی

ہے، (۴) قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہوا تھا کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوئی اور سورۂ بقرہ کی اس آیت سے کہ ماننسخ من ایۃ وننسھا قرآن کی کسی آیت کا ناسخ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اس کی بعض آیتوں سے شرائع سابقہ کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے، (۵) قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔ وہ جس طرح اور جس قدر ناز ہوا تھا اسی طرح اور اسی قدر زمانہ نزول سے آج تک محفوظ ہے اور جن روایتوں سے زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل کا ہونا یا بعض صحابہ کے اقوال سے قرآن کا توارد ہونا پایا جاتا ہے وہ سب موضوع و مفترے ہیں (٦) صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی ہی تمام حدیثوں کو جب تک کہ اصول علم حدیث کے موافق ان کی جانچ نہ کی جائے۔ قابل وثوق نہیں سمجھنا چاہیے، (۷) شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اس سے کوئی وجود الانسان مراد نہیں ہے بلکہ خود انسان میں جو نفس امارہ یا قوت بہیمیہ ہے وہ مراد ہے۔ (۸) طیور منخنقہ جن کو نصارے نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو مسلمانوں کو ان کا کھانا حلال ہے، (۹) چونکہ خبر واحد میں احتمال صدق و کذب باقی رہتا ہے اس لیے جو اعتراض اخبار آحاد کی بنا پر اسلام کی نسبت کیے جاتے ہیں اسلام ان کا جوابدہ نہیں ہے۔ (۱۰) سوان کفار و مشرکین کا قرآن کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یا جو اس آیت کے مصداق ہو کہ انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاہر وا علی اخراجکم ان تولوھم۔ کفار و مشرکین سے دوستی و موالات کرنا جائز ہے، (۱۱) عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں میں تحریف کی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریف معنوی ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ ان کا اول سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلم ہے، (۱۲) ہر شخص ان مسائل میں جو قرآن یا حدیث صحیح میں منصوص نہیں ہیں آپ اپنا مجتہد ہے، (۱۳) حضرت ہاجرہ جو اسمٰعیلؑ کی ماں ہیں وہ جیسا کہ بعض روایتوں میں مذکور ہے در حقیقت لونڈی تھیں بلکہ رقیون بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں اور رقیون نے ان کو صرف تربیت کے لیے حضرت سارا کے ساتھ کر دیا تھا، (۱۴) وضع و لباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبہ شرعاً ممنوع نہیں ہے، (۱۵) قرآن کی کسی آیت سے جبر پر اور کسی سے قدر پر استدلال کرنا جیسا

کہ متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لیے کیا ہے مقصد شارع کے برخلاف ہے ۔(۱۶) معراج اور شق صدر دونوں رویا میں واقع ہوئے ہیں نہ کہ بیداری میں کیا مسجد الحرام سے مسجد اقصی تک اور کیا مسجد اقصی سے آسمانوں تک ، (۱۷) اگرچہ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فروتر مخلوقات کو جود ہیں اس طرح اس سے بالاتر مخلوقات جس کا ہم کو علم نہیں ۔ موجود ہو لیکن ملائک یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں ان سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے جو مختلف قوے اپنی قدرت کاملہ سے مادہ میں ودیعت کیے ہیں جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوت جذب و دفع و امثال ذلک۔ انھیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔(۱۸) آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اس کے جذبات اور قوت بہیمیہ جو اس میں ودیعت کی گئی ہے اس کی برائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے۔ اور اس قسم کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں، (۱۹) معجزہ دلیل نبوت نہیں ہوسکتا، (۲۰) قرآن میں آنحضرتؐ سے کسی معجزہ کے صادر ہونے کا ذکر نہیں ہے، (۲۱) آیۃ الذین اتینا ھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم میں جو ضمیر مفعول لفظ یعرفونہ میں ہے وہ جیسا کہ عام مفسرین لکھتے ہیں آنحضرتؐ کی طرف عائد نہیں ہوتی ۔ بلکہ جیسا ابن عباس، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے منقول ہے تحویل قبلہ کے معاملہ کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کیا گیا ہے ۔(۲۲) آیۂ میراث سے وصیت کا حکم ۔ جو آیہ وصیت میں والدین اور دیگر ورثہ کے لیے تھا۔ منسوخ نہیں ہوا، پس جو وصیت وارث کے حق میں کی جائے وہ نافذ ہے ۔(۲۳) جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیہ وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں ۔بعض دیگر علما فدیہ کی اجازت کو خاص کر معمر لوگوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، مگر سرسید کے نزدیک، یہ حکم عموماً ان سب لوگوں کے لیے ہے جو جن کو روزہ رکھنا شاق ہو خواہ بڈھے ہوں اور خواہ جوان لیکن بہ نسبت فدیہ دینے کے ان کو روزہ رکھنا بہتر ہے ۔(۲۴) جس ربا یعنی سود کی حرمت قرآن میں بیان ہوئی ہے

اس سے اسی قسم کا ربا مراد ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سودخوروں اور رہٹیوں میں جن کا پیشہ سودخواری ہے پائی جاتی ہے۔ گراس سے اس منافع کی حرکت۔ جو پرامیسری نوٹوں پر لیا جاتا ہے۔ ثابت نہیں ہوتی، اس کے سوا کسی گورنمنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لیے روپیہ قرض لے اس کو سود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کا۔ جو کسی رفاہ عام کے کام کے لیے چندہ جمع کرے۔ اس روپیہ کا سود میں لگانا اور اس کے منافع سے رفاع عام کا کام کرنا یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے، (۲۵) قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حضرت عیسیٰؑ کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا ثابت ہو، (۲۶) شہدا کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اس سے ان کا علو درجات اور روحانی خوشی اور دنیا میں مثال قابل تقلید چھوڑنا مراد ہے نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور مثل زندوں کے کھاتے پیتے ہیں، (۲۷) صور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اس سے فی الواقع کوئی آلہ مثل نرسنگے یا سنکھ یا ترئی وقرنا کے مراد نہیں ہے بلکہ یہ محض استعارہ ہے کہ جس طرح ترئی کی آواز پر لشکر جمع ہو جاتے ہیں اسی طرح خدا کی مشیت اور ارادہ سے بعث و حشر واقع ہوگا۔ (۲۸) خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور اسماء وافعال کے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز واستعارہ وتمثیل کے بیان ہوا ہے اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے۔ جیسے بعث ونشر، حساب وکتاب، میزان، صراط، جنت، دوزخ وغیرہ وغیرہ۔ وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر۔ (۲۹) قرآن میں جو خدا کا زمین وآسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے۔ اس سے کسی واقعہ کی حبر دینی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہے کہ خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا۔ (۳۰) قرآن میں جو جابجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بداخلاقیاں پھیل جانے کے بعد ان پر طرح طرح کے عذاب کا نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے کسی کو زلزلہ سے کسی کو ٹڈیوں اور دیگر حشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو کسی عذاب سے اور کسی کو کسی عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے اس کا یہ مطلب یہ نہیں ہے کہ درحقیقت ان کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث

ہوئے تھے۔ (فوٹو اسٹیٹ کے صفحات کتابت ہو رہے ہیں)

[۱۲۸] مسلم کی حدیث ان قلا الامۃ تبھا ایک نشانی قیامت کی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جن دے گی اس سے مراد ایک ادارے کی حیثیت سے غلامی کا خاتمہ ہے (میزان ص ۱۷۶، ۲۰۱۰ء)

جدیدیت پسند مسلم مفکرین کا دعویٰ ہے کہ اسلام کی آمد کا ایک مقصد غلامی کا خاتمہ کرنا بھی تھا حیرت کی بات یہ ہے کہ خلافت عثمانیہ ۱۹۲۴ء میں ختم ہوگئی تب تک غلامی کے ادارے کو ختم کر دیا اس سے ثابت ہوا کہ غلامی کے خاتمے کے لیے پیغمبر کی اور اسلام کی آمد کی ضرورت نہ تھی غلامی اسلام کے بغیر بھی ختم ہوسکتی تھی دوسرا سوال یہ ہے کہ غلامی ختم ہوگئی ہے۔غلامی کی جدید ترین شکلیں نمودار ہوگئی ہیں پہلے محارب، خدا کے دشمن، مشرک اگر خدا کے راستے میں فساد پھیلاتے تو سزا کے طور پر غلام بنائے جاسکتے تھے یہ خلیفہ کی صواب دید پر منحصر تھا لیکن جدید عہد میں تو ہر شخص غلام ہے کسی کو آزادی میسر نہیں امریکہ کے منحرف کمپیوٹر ماہر Snowden کے انکشافات NSA سے متعلق اخبارات میں خبریں فیڈرل سرویلنس کورٹ میں مقدمے اور گوگل کے خلاف امریکی عدالتوں میں مقدمات کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا کے ہر شخص کو انفارمیشن ٹکنالوجی کے ذریعے غلام بنالیا گیا ہے روزانہ پچاس کروڑ لوگوں کے ٹیلی فون امریکہ ٹیپ کرتا ہے Penopkiton سوسائٹی وجود میں آ گئی ہے جہاں مختلف آنکھیں مختلف مقامات سے ایک فرد کو غیر محسوس طور پر غلام بنا رہی ہیں۔

file: Ehed Jadid Sawalat.inp

عہد جدید کے بعض راسخ العقیدہ اور اکثر جدیدیت پسند مفکرین کے نادر خیالات

[۱] اسلام دورِ جدید [Modern Age] کا خالق ہے دور جدید کا مذہب فی الاصل اسلام ہے —

[۲] اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو سائنس کے قدم بہ قدم چل سکتا ہے کیونکہ اسلام اور سائنس اور سائنس اور اسلام ایک ہی چیز ہیں، جز ہیں، ایک تصویر کے دو رخ، ایک دریا کے دو کنارے، ایک آسمان کے دو ستارے، ایک ہی حقیقت کے دو رنگ ہیں اسی لیے قرآن کی کوئی آیت سائنس کے خلاف نہیں ہوسکتی

— [۳] جدید سائنسی ترقی قرآن کی آمد کے بعد ہی ممکن ہوسکی جس نے تجربیت کا سبق دیا قرآن سے

پہلے تاریخ کے تمام معاشرے صرف عقلیت کے پرستار تھے تجربیت سے دور تھے قرآن نے تجربی دلائل کے ذریعے علوم کے قافلے کی رفتار کو بڑھا دیا۔ جدید سائنٹفک میتھڈ کا خالق اسلام ہے —[۴] اسلام ایک سائنٹفک مذہب ہے اس کا کوئی اصول سائنس سے متصادم نہیں جیسے جیسے سائنس ترقی کر رہی ہے قرآن کی بہت سی آیات کے مفاہیم واضح ہو رہے ہیں قرآن قیامت تک کے لیے آیا ہے لہٰذا قیامت تک قرآن کی آیات کے مفاہیم واضح ہوتے رہیں گے —[۵] مسلمانوں کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ جیسے ہی کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرے اسے داڑھی رکھوا کر، پگڑی پہنا کر، اونچا پاجامہ بندھوا کر اسے اپنی کمیونٹی کے لیے اجنبی کر دیتے ہیں وہ اپنی کمیونٹی میں دین کی دعوت پہنچانے کے قابل ہی نہیں رہتا یہ سب کام اچھے ہیں مگر ان کا وقت ٹھیک نہیں ہے مسلمانوں کی قدامت پرستی ہی ان کے دین کی توسیع میں اصل رکاوٹ ہے —[٦] اسلام اور مغرب میں چند چیزوں کے سوا کوئی فرق نہیں ہماری تمام اخلاقیات، عدل، انصاف، رواداری، دوسروں کا خیال، تحقیق، علم، تدبر، خدمت خلق وغیرہ جیسی صفات مغرب نے اسلام سے سیکھ لیں اور ہم سے آگے نکل گیا مغرب اگر صرف عریانی وفحاشی کو ترک کر دے اور کلمہ پڑھ لے تو کافی ہے اسلام اور مغرب میں بس چند ہی اختلافات ہیں —[۷] اسلام کا مقصد تسخیر کائنات تھا مسلمانوں نے یہ کام ترک کر دیا اور وہ تسخیر قلوب انسانی کے چکر میں پڑ گئے سائنسدانوں کی جگہ صوفیاء کو عزت دی گئی سوشل سائنٹسٹوں کی جگہ فقہا کو مقام و مرتبہ دیا گیا لہٰذا اسلام ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا اگر ہم ترقی کرتے رہتے تسخیر کائنات کے ذریعے کائنات پر غلبہ و تسلط حاصل کر کے کائنات کے عام خزانے مغرب کی طرح اپنے قبضے میں کر لیتے تو مغرب ہمیں کبھی اپنا غلام نہیں بنا سکتا ہم نے تین براعظموں پر حکومت کی مگر تسخیر کے قرآنی فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہے اس کا صلہ آج پوری امت بھگت رہی ہے —[۸] مسلمان تیل کے ذخیروں پر بیٹھے رہے مگر تیل دریافت نہ کر سکے وہ تیل دریافت کر لیتے تو دنیا پر ان کی حکومت قائم ہو جاتی، علماء فقہاء صوفیا نے امت کو فقہی شرعی روحانی موشگافیوں میں الجھائے رکھا لہٰذا علوم نقلیہ میں تو زبردست ترقی ہوئی دنیا کی کوئی قوم فقہ احسان تزکیہ نفس احکامات شرعیہ کے سلسلے میں امت مسلمہ، مقابلہ نہیں کر سکتی مگر ان علوم کو تمام علوم عقلیہ پر ترجیح دینے کے باعث مسلمانوں کی ترقی رک گئی وہ بچھڑ گئے دنیا کی تمام قوموں سے پیچھے رہ گئے اور اب آگے جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا —[۹] قرآن نے واضح طور پر کہا ہے کہ پہلے دنیا ہے پھر آخرت اس نے دنیا کو ترجیح دی ہے اس کے بعد

آخرت کا ذکر کیا ہے ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الا آخرة حسنة کا مطلب یہی ہے کہ دنیا کی فکر پہلے ہے آخرت کی فکر اس کے بعد ہے جو دنیا میں کچھ نہیں کر سکا دنیا کے لیے کچھ نہ لے سکا وہ آخرت کے لیے کیا لے گ جس کی دنیا بہتر ہے اسی کی آخرت یقیناً بہتر ہونے کا امکان ہے قرآن کا پیغام یہی ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کریں دنیا کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہیں جب وہ دنیا میں آگے رہیں گے تو لوگ ان کے آخرت کے پیغام کو بھی قبول کریں گے کیونکہ عام طبائع کی کم زوری یہی ہے کہ وہ دنیا والے کو دیکھ کر دین سے متاثر ہوتے ہیں اسی لیے انبیاء نے بھی اللہ سے دعا کی ہے کہ وہ ان کو سلطان کے ذریعے مضبوط کریں نصرت الٰہی اپنی جگہ مگر نصرت الناس اور نصرت اسباب بھی اہم ترین عامل ہے دین کی کامیابی کا جو دنیا میں ناکام ہے وہ آخرت میں بھی ناکام رہے گا — [۱۰] قرآن نے کہا ہے کہ اے ایمان والو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے — یعنی قرآن نعمت ہے دنیا کو سمیٹ لینے کی اجازت دیتا ہے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کس نے زینت دنیا کی چیزیں تم پر حرام کی ہیں لہٰذا دنیا میں بہترین خوشحالی مرفع الحال زندگی گزارنا کوئی جرم نہیں دین شریعت کا تقاضہ ہے اس معاملے میں امت کو رسالت مآب کی معاشی خاندانی زندگی کی پیروی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ قرآن نے عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی اجازت دی ہے قرآن کی نص کے سامنے رسول کا اسوہ حسنہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا وہ واجب الاتباع نہیں ہے قرآن کے نصوص واجب الاتباع ہیں لہٰذا بہترین پر تعیش زندگی بسر کرنا قرآن کے فہم دینی کا تقاضہ ہے — [۱۱] اسلام نے دنیا کو سب سے پہلے جمہوریت کا درس دینا رسول کو حکم دیا گیا کہ آپ صحابہ سے مشورہ کریں یہی جمہوریت کا پہلا سبق تھا رسول اللہ نے جمہوری روح کے پیش نظر حضرت ابو بکر کو نامزد کیا ان کو یقین تھا کہ جمہوریت صحیح طریقے سے کام کرے گی تو جمہور خود ہی ابو بکر کو منتخب کر لیں گے اور عملاً یہا ہوا اس طرح رسالت مآب دنیا کی پہلی جمہوریت کے بانی ہیں تمام خلفائے راشدین کا انتخاب جمہوریت کے ذریعے ہی ہوا اسلام اور جمہوریت لازم و ملزوم ہیں مغرب نے جمہوریت کا سبق اسلام سے لیا ہے مگر وہ آج خود کو جمہوریت کا...... کہتا ہے جو جھوٹ ہے جمہوریت کے اصل بانی رسالت مآبؐ ہیں ہم نے دنیا کو سب سے پہلے جمہوریت کی روشنی دکھائی۔ رسالت مآبؐ نے حضرت ابو بکرؓ کی نامزدگی مسترد کر کے جمہوریت کی شمع روشن کی جو آج تک روشن ہے بلکہ اس کی روشنی عالمگیر ہو گئی ہے اور اقوام متحدہ بھی اسی روشنی میں تمام جمہوری فیصلے کر رہی ہے — [۱۲] اسلام نے پندرہ

سوسال پہلے سب سے پہلے عورت کے حقوق دیے جائیداد کا حق میراث کا حق ذاتی ملکیت کا حق کاروبار، نوکری کا حق، مہر کا حق جو مرد اس کی اجازت کے بغیر ہرگز استعمال نہیں کرسکتا عورت کمانے کے لیے گھر سے باہر جاسکتی ہے اسلام اس کے نوکری کے حق کو تسلیم کرتا ہے جو کچھ وہ کمائے وہ اسی کا ہے کوئی اسے محروم نہیں کرسکتا، عورت کی مرضی کے بغیر شادی نہیں ہوسکتی یہ اس کا حق ہے عورت اپنی مرضی سے شادی کرنے میں آزاد ہے منشور بنیادی حقوق تو اٹھارہویں صدی میں لکھا گیا ہے اسلام اس سے پہلے ہی عورت کو وہ بے مثام آزادی دے چکا ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی منشور بنیادی حقوق اصلاً خطبہ حجۃ الوداع کا چربہ ہے یہ تمام حقوق اسی منشور سے لیے گئے ہیں اوراب مغرب اس منشور کا خالق بن کر دنیا بھر سے داد سمیٹ رہا ہے حالانکہ اس منشور کے اصل خالق مسلمان ہیں یعنی خطبہ حجۃ الوداع—[۱۳] اسلام ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے زمانہ ہمیشہ آگے بڑھتا ہے تہذیب وتمدن کا کارواں مسلسل سفر میں ہے اور آگے بڑھتا رہے گا اسلام ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے ہر اگلا زمانہ تہذیب تمدن ترقی کے اعتبار سے پچھلے زمانے سے لازماً بہتر ہوتا ہے اور ترقی کرتا ہے اسلام ہر زمانے کی ہر ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے اسلام بدلے ہوئے حالات میں بدلے ہوئے حالات کے ساتھ قدم بہ قدم چل سکتا ہے بلکہ اسلام زمانے سے بھی آگے چلتا ہے کیونکہ اس کی جو ترقی کی رفتار ہوتی ہے وہ زمانہ سے زیادہ تیز ہوتی ہے—[۱۴] جدید سائنس کی ترقی کی رفتار رک گئی ہے اگر جدید سائنس اسلام کو قبول کر لیتی تو اس کی ترقی کی رفتار اتنی تیز ہوتی بلکہ انسان اس کا تصور کرنے سے قاصر تھا خدا بے زار سائنس بہت سی نعمتوں خصوصاً ترقی کی نعمت سے محروم ہوگئی—[۱۵] اسلام نے دنیا کے انسانوں کو سب سے پہلے آزادی دی اسلام نے انسانوں کو جو آزادی دی ہے وہ دنیا کا کوئی مذہب اور قانون نہیں دے سکتا اسلام نے عورتوں کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ آزادی دی ہے عورت اسلام میں دی گئی آزادی سے زیادہ آزادی حاصل نہیں کرسکتی لہٰذا اسلام ہی آزادی کا سب سے بڑا محافظ اور نگہبان ہیا سلام اور آزادی لازم وملزوم ہیں—[۱۶] رسالت مآب نے فرمایا تھا کہ میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسی امت جو فخر کے قابل ہو جو دینی تعلیم وتربیت اخلاق فاضلہ سے مزین ہو جس کے اعمال فخر کے طور پر پیش کیے جاسکیں مگر امت نے اس حدیث کا مطلب صرف یہ لیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بچے صبح وشام پیدا کرتے چلے جانا— اسی لیے یوروپی لوگ مسلمانوں پر پھبتی کستے ہیں کہ یہ قوم چوہوں کی طرح اپنی نسلیں بڑھا رہی ہے تاکہ

عددی طور پر یوروپی قوموں کو صفحہ ہستی سے مٹا دے چوہوں کی طرح نسلیں پیدا کرنے کے باعث نہ ان کی تعلیم و تربیت ممکن ہے، نہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، نہ ان کو پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہے، نہ اچھے کپڑے، نہ اچھی رہائش، ان کو پیدا کرنے والی عورتوں کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی —— ایسی بیمار، بے کار، غیر تعلیم یافتہ نسلیں پیدا کر کے ہم رسالت مآبؐ کی حدیث پر عمل نہیں کر رہے بلکہ حدیث کی روح کا انکار کر رہے ہیں مسلمانوں کو فخر ہے کہ ان کی آبادی دنیا میں تیزی سے بڑھ رہی ہے مگر یہ بڑھتی ہوئی بے کار آبادی کسی کام کی نہیں —— [۱۷] مغرب کے پاس جو کچھ بھی اچھائی اور خیر ہے وہ مغرب نے ہم سے لیا ہے مغرب نے قرآن سے علم، تحقیق، تجربہ، استقراء کا طریقہ سیکھا —— یہ سائنس اسے اندلس سے ورثے میں ملی راجر ز بیکن اندلس سے پڑھ کر آیا تھا مغرب کے تمام بڑے لوگ اندلس کی سائنسی ترقی سے متاثر تھے مسلمانوں کی ترقی رک گئی مگر یورپ نے اس ترقی کو بڑھاوا دیا اور ہم سے آگے نکل گیا اگر اندلس نہ ہوتا تو مغرب آج اس مقام پر نہ ہوتا ہم اپنا سبق بھول گئے مغرب نے ہمارے بھولے ہوئے سبق کو یاد رکھا اور دنیا پر چھا گیا مغرب کی سائنس ٹکنالوجی اس کی نہیں اسلام کا عطیہ ہے یہ ہماری متاع گم شدہ ہے اس کو مغرب سے چھیننا ہے تاکہ مسلمان دوبارہ اس دنیا پر غلبہ حاصل کر سکیں جب تک مسلمان اپنی متاع میراث مغرب سے واپس نہ لیں گے دین کو غلبہ عطا نہ ہوگا لہٰذا امت کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس سائنس وٹکنالوجی کو کسی قیمت پر کسی طرح مغرب سے حاصل کرے اس کے بغیر اس امت کا احیاء، تسلط، غلبہ دنیا پر ممکن ہی نہیں ہے —— [۱۸] عیسائیت کو مغرب میں شکست اس لیے ہوئی کہ عیسائیت کا مذہب سائنس کے ساتھ نہیں چل سکا عیسائیت نے سائنس سے دشمنی کی کیوں کہ اس کی تعلیمات سائنس کی عظمت نہ پہچان سکیں۔

لہٰذا پوپ اور چرچ سائنس اور سائنس دانوں کے خلاف ہو گئے عیسائی عقلیت، تجربیت، فلسفے کے بھی خلاف تھے ان کے پاس کوئی علمی روایت نہ تھی پوپ کا حکم حرف آخر ہوتا تھا وہ اپنے سوا کسی کی بات نہ مانتا تھا پوپ نے بڑے بڑے سائنس دانوں کو مذہبی بنیاد پر پھانسی دی سائنس دشمنی کے باعث لوگ پوپ کے خلاف ہو گئے انھوں نے کلیسا کو شکست دے دی اسلام کا تجربہ اس سے مختلف تھا اسلام نے ہمیشہ سائنس سے مطابقت پیدا کی سائنس اور اسلام میں کبھی تصادم نہیں ہوا اس لیے اسلام محفوظ رہا۔ —— [۱۹] قرآن نے اصول استخراج سے دنیا کو روشناس کرایا تجربیت کے ساتھ اسلام نے عقلیت پر بھی زور دیا

اس طرح دنیا کو ترقی کا راستہ دکھایا مسلمان دنیا کو یہ اسباق دینے کے بعد خود تصوف فقہ شریعت کی وادی میں گم ہو گئے اور ان کی ریاست بھی اس لیے ختم ہو گئی فقہی مکاتب فکر نے جمود کا راستہ ہموار کیا تقلید نے تباہی پیدا کی کتابوں پر حاشیے اور حاشیوں کے حاشلیے لکھنے کا رواج ہوا اپنے سوا سب باطل قرار پائے جمود نے اجتہاد کا دروازہ بند کیا اجتہاد ختم ہونے سے امت کے عروج کے تمام راستے بند ہو گئے جب تک امت تحقیق و اجتہاد کرتی رہی علم کی شمع روشن رہی، سائنس وٹکنالوجی میں مسلمان آگے رہے کوئی ہمیں شکست نہیں دے سکا علم و تحقیق سائنس اور اجتہاد مترادف اصطلاحات ہیں امت نے اجتہاد کو صرف دینی امور تک محدود کر دیا اور اس میدان میں بھی اجتہاد نہیں کیا اجتہاد کے بارے میں علماء کی تنگ نظری نے انھیں تباہ کیا اور اس کے باعث ملت تباہ ہو گئی۔ــــ[۲۰] ہمیں روایتی اسلام کی نہیں پروگیسو رودار حقیقی اصلی اسلام کی ضرورت ہے جس کی روح قدیم ہو لیکن قالب جدید ــــ جس کا جوہر پرانا ہو مگر جس کا ظاہر بالکل نیا ہو، جس کے مقاصد قدیم مگر جس کے اظہار کے طریقے نئے ہوں، جو جدید و قدیم کا جامع ہو، جو دنیا و دین کا آمیزہ ہو، جو دین میں پیغمبروں کے طرز عمل کو اختیار کرے اور دنیا کے امور میں فرعون جیسی شان و شوکت کا علمبردار ہو، دین کا غلبہ عہد حاضر میں اسی ذریعے سے ممکن ہے ــــ مسلمان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ اسلام کو پبلک لاء کے بجائے پرائیوٹ زندگی تک محدود کر لیں تا کہ مذہب کی بندش اور پابندیاں ان کی ترقی میں رکاوٹ نہ ڈالیں جب ریاست کے مذہبی قوانین حلال وحرام، صحیح و غلط، کا تعین کرتے ہیں تو سرمایہ کار کارخانے نہیں لگاتے ترقی کی رفتار رک جاتی ہے کیونکہ پبلک لاء میں مذہب کو لانے سے سرمایہ کاری میں زبردست رکاوٹ ہوتی ہے مثلاً پاکستان کے شمالی علاقے جو روئے زمین پر جنت ہیں وہاں سیاحت اس لیے نہیں ہو سکتی کہ لوگ مغرب کے بعد سو جاتے ہیں اپنی عورتوں کو سیاحت کی صنعت میں خدمت کرنے، پیسہ کمانے کے لیے بھیجنا پسند نہیں کرتے سیاح سیر و تفریح لطف اٹھانے کے لیے آتے ہیں عورت کے بغیر سیاحت کیسے چل سکتی ہے دقیانوسی رسوم اور قدامت پرستی کے باعث ان کی معاشی حیثیت کم زور رہتی ہے غربت میں گرفتار رہتے ہیں جو کچھ مل گیا اس پر قناعت کرتے ہیں تقدیر پر راضی رہنے کے باعث یہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے ان کے بڑے بڑے خاندان کئی کئی بچے ان کی معاشی ترقی میں رکاوٹ ہیں جتنے کم بچے جتنا چھوٹا خاندان ہوگا اللہ کی رحمت اتنی زیادہ ہوگی زیادہ معاشی ترقی ہوگی زیادہ تمتع کر سکیں گے اچھی تعلیم دلا سکیں گے۔ ترقی نہ ہونے سے GDP، GNP میں اضافہ

نہیں ہوسکتا export نہیں بڑھ سکتی سیاح نہیں آ سکتے ٹیکس نہیں مل سکتا فارن ایکسچینج نہیں آ سکتا ورنہ اتنا سرمایہ ملے گا کہ اس خطے کے لوگوں کی معاشی زندگی بالکل بدل جائے گی اسی طرح سوات، بلوچستان وغیرہ کے علاقوں میں اعلیٰ سیب، انگور پیدا ہوتا ہے وہاں غیر ملکی کمپنیوں کو شراب بنانے کی اجازت دے دیں یہ شراب فرانس یا یورپ جائے گی مقامی لوگوں کو ایک قطرہ بھی نہیں ملے گا ملازمین بھی غیر ملکی ہوں گے صرف زمین انگور سیب مقامی ہوں گے ملک کی معاشی ترقی بڑھ جائے گی لیکن مذہب کی قدامت پرستی قدم قدم پر سرمایہ کاری کی راہ میں سرمایے کے اضافے میں صنعتی و معاشی ترقی میں رکاوٹ پیدا کر کے پاکستان کو پیچھے کرتی جارہی ہے سور، کتے پاکستانی نہیں کھاتے مگر کھانے والوں کو ایکسپورٹ کر کے فارن ایکسچینج تو کما سکتے ہیں لیکن مسلمان نہ تو خود سور کھاتے، نہ شراب پیتے نہ دوسرے کو کھانے پینے دیتے ہیں ان میں رواداری [Tolerance] نہیں ہے، وہ اپنے سوا، اپنے دین کے سوا، اپنی روایات کے سوا کسی کو درست نہیں سمجھتے وہ خبط عظمت میں مبتلا ہیں اسلاف پرستی میں گرفتار ہیں وہ زمانے کی رفتار کا ساتھ نہیں دینا چاہتے زمانے کے ساتھ چلنے کے بجائے زمانے کو اپنے مطابق چلانا چاہتے ہیں یہی ان کی دنیا اور آخرت میں تباہی کا اصل سبب ہے دنیا میں بھی......رہیں گے اور آخرت میں بھی ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوگی جو دنیا میں کچھ نہیں کرسکتا وہ آخرت میں کیا کر سکے گا ــــ[۲۱] امام غزالی وغیرہ نے دین کو صرف پانچ مقاصد شریعہ تک محدود کر کے اس زمانے کے مطابق دین کی تشریح اب زمانہ بدل گیا ہے لہٰذا مقاصد شریعہ کی فہرست میں اضافہ لازمی ہے جدید زندگی جدید تقاضے لا رہی ہے لہٰذا ان تقاضوں کے مطابق دین کو اپنے جوہر کو برقرار رکھتے ہوئے دنیا کے حل پیش کر کے

جو لوگ مقاصد شریعت کی فہرست میں اضافے کو بدعت سمجھتے ہیں اور عصری تقاضوں کو پہچاننے سے قاصر ہیں ایسے ہی لوگ دین کے غلبے و عروج کی راہ میں اصل رکاوٹ ہیں جدید عہد کا تقاضہ ہے کہ ترقی کو مقاصد شریعت کی فہرست میں شامل کیا جائے تسخیر کائنات کا بھی اضافہ کیا جائے اعلیٰ معیار زندگی، عورت کی تعلیم، عورت کی نوکری، روزگار، کاروبار کو بھی جدید فہرست میں داخل کرنا چاہیے۔ــــ[۲۲] اسلام نے عورت پر وہ حدود عائد نہیں کی جو فقہائے کرام نے عائد کردی ہیں قرن فی بیوتکم کی آیت کا مطلب وہ نہیں جو علماء نے سمجھا اس آیت کی غلط تفسیر عورت کی ترقی میں اصل رکاوٹ ہے یہ آیت ازواج مطہرات تک محدود ہے اس کا دائرہ وسیع کرنے کے باعث عالم اسلام کی پچاس فی صد آبادی گھروں میں مسدود،

محصور، محدود اور مقید ہے یہ بہت بڑا نقصان ہے اگر عورت گھر میں بیٹھے رہے گی تو اسکول، کالج ، یونیورسٹی، ہسپتال کیسے چلیں گے عورت کو عورت پڑھائے گی، عورت کا علاج عورت کرے گی تو عورت گھر سے نکلے بغیر یہ سب کام کیسے کرے گی اور ہر وقت مرد تو عورت کے ساتھ نہیں جا سکتا لہٰذا عورت کو خود ہی سفر کرنا ہوگا مردوں سے میل جول بالکل فطری بات ہے لیکن ملاؤں نے شریعت کی جو تعبیر پیش کی ہے وہ تو عورت کے گھر سے نکلنے کو ہی ناممکن بنا دیتی ہے لہٰذا اب دین کی نئی تشریح کی ضرورت ہے پندرہ سو سال سے عورت کا مقام گھر بنانے والی تشریحات عصر حاضر میں نہیں چل سکتیں ان کو نظر انداز کیے بغیر مسلمانوں کی آدھی دنیا ترقی نہیں کر سکتی ترقی کے بغیر آمدنی میں اضافہ نہیں ہوسکتا آمدنی میں اضافے کے بغیر GNP، GDP میں اضافہ نہیں ہوسکتا اس اضافے کے بغیر دنیا کی قوموں میں ہمیں بلند مقام نہیں مل سکتا قرآن کی قدیم تفاسیر اب چلنے والی نہیں ہیں جدید تفاسیر جو قدیم رنگ میں لکھی گئی ہیں یہ بھی چلنے والی نہیں ان سب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے — [۲۳] قرآن کی تفسیر لکھتے ہوئے اور فقہ کی کتابیں مرتب کرتے ہوئے ان میں غلام و لونڈی کے مسائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ غلام لونڈی اب ختم ہو چکے ہیں اسلام نے غلامی کا خاتمہ کر دیا ہے لہٰذا مدارس میں بھی ان موضوعات کو پڑھا کر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے اب غلامی کا زمانہ واپس نہیں آ سکتا جب زمانہ ہی ختم ہوگیا تو اس کا علم دینے کی کیا ضرورت ہے جدید فقہی کتب سے ان مسائل کو خارج کر دیا جائے اسی طرح دیگر احکامات جو زمانہ کے بدلنے سے اب بدل گئے ہیں یا جن پر عمل ممکن نہیں رہا ان پر فقہی مباحث پڑھانے اور کتابوں میں شامل کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ وقت کا زیاں ہے — [۲۴] رسالت مآب ﷺ آخری پیغمبر ظاہر تھے ان کے بعد نبوت ختم ہوگئی کیونکہ انسانی شعور نے اتنی ترقی کی کہ اب وہ نبوت کے محتاج نہ رہی الکتاب کافی ہے پیغمبر ظاہر کی عدم موجودگی میں پیغمبر باطن [عقل] موجود ہے جو ابد تک موجود رہے گا جو ہماری رہنمائی و رہبری کے لیے کافی ہے اسلام خالص عقلی مذہب ہے وہ رسوم و رواج اور قصے کہانیوں کا دین نہیں ہے شریعت کے احکامات کا اطلاق صاحب عقل پر ہوتا ہے فاطر العقل پر نہیں پاگل پر شریعت لاگو نہیں ہوتی عقل کا انہدام فرد کو شریعت سے آزاد کر دیتا ہے لہٰذا شریعت عقل سے آزاد نہیں ہوسکتی عقل و نقل میں کوئی تعارض نہیں ہے قرآن کا وئی حکم شریعت کا کوئی فیصلہ عقل کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ عقل و نقل میں تطبیق سے ہی شریعت موثر ہوتی ہے عقل کی اپنی حدود ہیں، نقل کی اپنی حدود ہیں، وحی کی اپنی حدود ہیں، ہر شے اپنی

حدود میں رہے اور کوئی دوسری کے اقلیم میں مداخلت نہ کرے تو کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا لہٰذا افراط وتفریط کے باعث ہم ایک ذریعے کو دوسرے ذریعے، ایک ماخذ کو دوسرے ماخذ کی اقلیم میں دخل اندازی کی اجازت دیتے ہیں جس کے باعث مسئلے پیدا ہوتے ہیں — [۲۵] یوروپ میں کیتھولک ازم اور پروٹسٹنٹ ازم کے مابین لڑائیوں، خانہ جنگیوں، قتل وخون کے باعث مستقل بدامنی تھی لبرل ازم آیا تو اس نے مذہبی مسائل حل کر دیے اب یوروپ میں کوئی مذہبی بنیادوں پر نہیں لڑتا سب لوگ مستقل مذہب رکھنے کے باوجود روادار ہو گئے ہیں سب ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں سب ایک دوسرے کو مساوی سمجھتے ہیں، سب اپنے اپنے تصور خیر کو دوسرے کے تصور خیر کے مساوی سمجھتے ہیں اپنے خیر کو دوسرے پر برتر فائق نہیں سمجھتے لہٰذا اختلافات نہیں پیدا ہوتے سب امن وامان سے رہ رہے ہیں اب پاکستان میں تمام فرقہ وارانہ تنازعات کی اصل وجہ یہ مذہبیت ہے اس کے خاتمے کے بغیر ملک میں امن وامان قائم نہیں ہو سکتا امن نہ ہو تو ترقی نہیں ہو سکتی لہٰذا مذہبی جھگڑے ختم کیے بغیر مذہب تشدد پسندی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

سرقہ بازی

غامدی صاحب موسیقی پر کلام اللہ کا پڑھنا جائز سمجھتے ہیں

اسلام اور موسیقی: جاوید غامدی کی خدمت میں: غور وفکر کے لئے

غامدی صاحب اور جدیدیت پسندوں کا خاص طریقہ واردات

جاوید غامدی صاحب کے ادارے دار التذکیر سے جدیدیت پسند عالم اور پرویز صاحب کے مداح جناب جعفر شاہ پھلواری کی کتاب ریاض السنہ کے نام سے شائع ہوئی ہے اس کتاب میں پھلواری صاحب نے ''جمع الفوائد'' سے اپنی دانست میں موسیقی کے حق میں اور گانے بجانے کی حمایت میں کُل تین احادیث اکٹھا کی ہیں اور ان حدیثوں کا غلط سلط ترجمہ وتشریح بیان کر کے بہ ظاہر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد رسالت میں علم موسیقی اور موسیقاروں کی بلکہ گویوں کی نہ صرف سرپرستی کی جاتی تھی بلکہ رسالت مآب ان کی اصلاح بھی فرماتے تھے تاکہ یہ علم ترقی کرے حیرت یہ ہے کہ ان احادیث سے موسیقی، گانے بجانے کی تائید تو نہیں ہوتی لہٰذا پھلواری صاحب نے اپنے مطلب کو حدیث میں داخل کرنے کے لئے اس پر نہ صرف اپنی مرضی کی سرخیاں لگائی ہیں بلکہ ترجمے میں جان بوجھ کر تحریف کر کے اپنے مطالب پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن پھر بھی تحریف نہ کر سکے، مثلاً ایک سرخی ہے عورتوں کا گانا سننا، گانا بجانا ص ۴۳۸، چند لڑکیوں کے گانے پر حضورؐ کا اظہار پسندیدگی، جبکہ ان تمام احادیث میں ذکر بچیوں کا ہے عورتوں کا نہیں اور الفاظ میں جارتیان، جوار، جاریہ سودا کے الفاظ آئے ہیں، لیکن اس کا ترجمہ جان بوجھ کر عورت کیا گیا ہے تاکہ مغالطہ پیدا کیا جائے۔ ایک سرخی پھلواری صاحب کے قلم سے ہے ''گانے والیوں کی اصلاح'' گویا رسالت ماب گویوں گلوکار عورتوں اور مغنیوں کی اصلاح کے لئے آئے تھے نعوذ باللہ حالانکہ اصلاح آپؐ نے بچیوں کے شرکیہ الفاظ کی فرمائی تھی ان تین احادیث سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے اگر زیادہ سے زیادہ ثابت کیا جا سکے کہ خوشی کے موقع پر کم عمر بچیاں اگر ملی حمیت اور جہادی جدوجہد سے متعلق اشعار دف پر گائیں ایسے اشعار جن میں موت، جذبہ ایمانی، شوکت اسلامی، نغمہ روحانی، شہادت، میدان جہاد، مقاتلے، مقابلے، مجاہدے، تزکیۂ نفس، قلب مطمئنہ، نغمۂ مبارزت، شہداء، صدیقین انبیاء کا ذکر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، انھیں کسی درجے میں برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن یہ رویہ بھی ایک طرزِ زندگی کے طور پر اسلام کو قبول نہیں ترمذی کی حدیث اس موقف کو موکد کرتی ہے لہٰذا ترمذی کی

روایت کے مطابق جب سیاہ فام لڑکی حضرت عمر کو دیکھ کر دف الٹ کر اس پر بیٹھ گئی تو رسالت ماب کی خوشی دیدنی تھی رسالت ماب نے واضح طور پر اس لڑکی کے فعل کو ناپسندیدہ قرار دیا اور فرمایا اے عمر شیطان تم سے خوف کھاتا ہے یعنی لڑکی کا دف بجانا شیطانی کام ہے امید ہے غامدی صاحب اپنی اصلاح فرمائیں گے اور اپنے ادارے کی شائع شدہ کتاب میں احادیث کے متن سے فکر و نظر کے چراغ خود روشن کر لیں گے۔ ذیل میں ان تین احادیث کا مطالعہ فرمایئے سرخیاں ہماری ہیں۔

گانا بجانا اسلامی رویہ نہیں: حدیث نبویؐ:

حضورﷺ کسی غزوے میں تشریف لے گئے۔ جب واپس آئے تو ایک سیاہ فام بچی حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی کہ: میں نے منت مانی تھی کہ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ صحیح سلامت واپس لے آئے، تو میں حضورﷺ کے سامنے دف بجا بجا کر گاؤں گی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: اگر تیری یہ منت ہے تو پوری کر لے، ورنہ رہنے دے۔ اس نے کہا کہ: میں نے تو یہ منت مانی تھی، اس کے بعد دف بجانے لگی۔ رزین کی روایت میں ہے کہ وہ طلع البدر علینا الخ گا رہی تھی۔ پھر حضرت علیؓ آئے اور وہ حسبِ معمول اپنے کام میں لگی رہی۔ پھر حضرت عثمانؓ آئے اور وہ اسی طرح مصروف رہی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ آئے تو وہ اپنی دف اُلٹ کر اس پر بیٹھ گئی۔ حضورﷺ نے فرمایا کہ: اے عمرؓ! شیطان تم سے خوف کھاتا ہے۔ دیکھو میں بیٹھا تھا تو یہ لڑکی گا رہی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے ابو بکرؓ و علیؓ اور عثمان آئے اور یہ اپنے شغل میں لگی رہی لیکن جب تم آئے تو اس نے اپنی دف کو الٹ دیا۔ [ترمذی] واضح رہے کہ بچی شہدائے بدر کو یاد کر رہی تھی پھر بھی غناء اور دف کو پسند نہیں کیا گیا۔

بچیوں کا گانا بھی پسندیدہ نہیں: حدیث نبویؐ:

حضورﷺ میرے ہاں تشریف لائے تو اس وقت دو بچیاں جنگ بعاث کے گانے گا رہی تھیں۔ حضورﷺ بستر پر لیٹ گئے اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ اتنے میں حضرت ابو بکرؓ تشریف لے آئے تو مجھے ڈانٹ کر کہا کہ: رسولؐ اللہ کی موجودگی میں اور یہ شیطانی گیت؟ حضورؐ نے جناب ابو بکرؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: رہنے دو ان بیچاریوں کو۔ جب وہ خاموش ہو گئے تو میں نے ان دونوں چھوکریوں کو اشارہ کیا اور وہ چلی گئیں۔ اس روز عید بھی تھی اور حبشی مسجد میں اپنی ڈھالوں اور نیزوں کے کرتب دکھا رہے تھے۔ اس کے بعد میرے پوچھنے پر یا از خود حضورؐ نے فرمایا کہ: کیا تمہیں [حبشیوں کا کھیل] دیکھنے کی

خواہش ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں۔ پھر حضورؐ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کر لیا کہ میرا رخسار رخسارِ نبویؐ سے ملا ہوا تھا [یعنی حضورؐ کے کاندھے پر میری ٹھوڑی تھی]۔ حضورؐ فرماتے جاتے: بنی ارفدہ [یعنی حبشیوں] دکھاؤ اپنے کرتب۔ آخر میں کھڑے کھڑے اکتا گئی تو حضورؐ نے فرمایا: بس؟ میں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: تو اب جاؤ۔ [شیخین، نسائی] حضرت ابوبکرؓ جنگ بعاث کے تذکرے کو بھی شیطانی گیت قرار دیتے ہیں رسالت مآب درگزر کی ہدایت فرماتے ہیں اس ذرا سے معاملے سے موسیقی کا حلال ہونا اس کی ریاستی سرپرستی کا جواز کہاں ثابت ہو گیا؟

بچیاں اگر گائیں تو کیا؟: حدیث نبویؐ:

جب میری رخصتی ہو چکی تو حضور ﷺ میرے غریب خانے پر جلوہ افروز ہوئے اور میرے ہی بستر پر بیٹھ گئے۔ چند بچیاں دف بجا بجا کر بدر میں شہید ہونے والے اپنے بزرگوں کی مدح سرائی کرنے لگیں۔ جب ایک نے یہ مصرع گایا کہ ''فینا نبی یعلم ما فی غد'' [ہم میں ایک پیغمبر ایسا ہے جو یہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا] تو حضور ﷺ نے اس سے فرمایا کہ: یہ نہ کہو اور وہی کہو جو تم پہلے کہہ رہی تھیں۔ [بخاری، ابو داؤد، ترمذی] حضورؐ نے گانے والی بچیوں کے شرکیہ الفاظ کی اصلاح فرمائی اس سے گویوں کی اصلاح کے جواز کا راستہ دکھا کر موسیقی کو حلال قرار دینا محض جدیدیت پرویزیت، پھلواریت بلکہ غامدیت ہے۔

ٹی وی کے ڈراموں کھیل تماشوں، لہولعب میلوں ٹھیلوں کے جواز میں غامدی صاحب اور ان کے حلقے نو آموز جہلاء درج ذیل حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

فن سپہ گری کا معاملہ عورت کے لئے:

حضور نے میرے حجرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر مسجد میں فن سپہ گری دکھانے والے حبشیوں کے کرتب دیکھے اور مجھے یہ اپنی چادر میں چھپا کر دکھائے اور میں انھیں دیکھتی رہی [شیخین] اس حدیث سے جدیدیت پسندوں کا یہ استدلال کہ لہولعب کھیل تماشے ایک دینی رویہ ہیں اور اس رویے کو لازم دین اور اسلامی ثقافت وتہذیب کے اہم مظہر کے طور پر پیش کرنا محض دجل، فریب، گستاخی، بے ادبی اور ڈھٹائی ہے اس حدیث کو ٹی وی ڈراموں کی تائید میں لانا اور یہ کہنا کہ نعوذ باللہ رسول اللہ اپنی اہلیہ کو دل لگی کے کام دکھاتے تھے محض دنائت وخباثت نفس ہے مسجد جیسے مقدس مقام میں فن سپہ گری کے مظاہروں اور ٹی وی ریڈیو سرکس کے ڈراموں اور کھیل تماشوں میں مشابہت ومماثلت تلاش کرنا غامدیت کا کمال

ہے۔

عورت کی منت دف بجانا: حدیثنبویؐ:

ایک عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے منت مانی تھی کہ اگر حضورؐ اس غزوے سے صحیح سلامت واپس تشریف لے آئیں گے تو میں آپ کے سر پر کھڑے ہو کر دف بجاؤں گی فرمایا اگر تو نے یہ منت مانی ہے تو آپوری کر لے ورنہ رہنے دے [ابو داؤد] اس حدیث سے غامدی صاحب وحید الدین خان اور جدیدیت پسندوں کا پورا حلقہ موسیقی کا جواز ثابت نہیں کر سکتا اس سے تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسالت مابؐ اتنے حلیم و کریم تھے کہ ایک لغو کام کی اجازت عورت کا دل رکھنے کے لیے دے دی آپ کو حلم و کرم کا عالم یہ تھا کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے کفن کے لیے آپ نے کرتے کا کپڑا عنایت کیا نماز جنازہ میں تشریف لے گئے تا آنکہ کہ وحی الٰہی نازل ہوئی اور آپ کو نماز پڑھنے سے روک دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کی مغفرت کی دعا کریں تو یہ قبول نہیں کی جائے گی۔

یہ احادیث جناب غامدی صاحب کی فکر کو فروغ دینے والے ادارے دارالتذکیر سے شائع کردہ کتاب ''ریاض السنہ'' کے صفحہ نمبر ۴۹۸، ۴۳۹، ۵۱۶ پر دیکھی جاسکتی ہیں ان احادیث سے زیادہ سے زیادہ کس قسم کے اشعار اور کس قسم کی موسیقی کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے ظاہر و باہر ہے صرف دف بجانے کو موسیقی کہنا عربوں کے فن موسیقی سے ناواقفیت ہے سوق عکاظ کے میلوں میں موسیقی کا نام کیا صرف دف، بجانا تھا کیا علم موسیقی کی ابتداء وانتہاء دف ہے؟ کیا رخصتی کے وقت عہد حاضر کے گویے جنگ بعاث کے گیت گاتے ہیں کیا میلوں ٹھیلوں کے گانوں میں شہداء اسلام اور بزرگوں کی مدح سرائی کی جاتی ہے، کیا پیغمبر علیہ صلوۃ والسلام کی مدح پڑھی جاتی ہے؟

تمام جدیدیت پسندوں خصوصاً غامدی صاحب کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ اسلام سے موسیقی کا جواز ضرور ثابت کریں گے لیکن کبھی ان کی زبان سے، قلم سے موجودہ موسیقی کی مذمت نہیں ہوگی وہ محض اصولی باتیں بیان کر کے عہد حاضر کی موسیقی سے انجان بن جائیں گے جیسے جانتے ہی نہیں لہٰذا اس کی مضرتوں اس کے کفر پر خاموش رہیں گے۔ غامدی صاحب کبھی یہ نہیں لکھیں گے نہ فرمائیں گے کہ ٹی وی کے تمام چینلوں سے، ڈش سے ریڈیو اور کیسٹوں سے جس جس قسم کی موسیقی اور جس قسم کے اشعار پڑھے جا رہے ہیں اسلام میں اس کی اجازت نہیں یہ سب اسلامی منہاج میں حرام ہیں ان کا جواز اسلام نہیں دے

سکتا غامدی صاحب کبھی غالب رواں، جاری موجود نظام موسیقی کو ہدف تنقید نہیں بنائیں گے کہ یہ استعماری حکمت عملی کے خلاف ہوگا وہ صرف دین میں رخنے نکالیں گے۔ ان کے اعتراضات اور تنقید کا ہدف وہ اہل دین ہوں گے جو موسیقی نہیں سنتے وہ انھیں قائل کریں گے کہ تم موسیقی سنو یہ تو سنت سے ثابت ہے ان کی دعوت تربیت و تعلیم کا ہدف آوارہ عریاں بے پردہ بے حجاب عورت نہیں ہوگی ان کا خطاب اس حیادار دوشیزہ سے ہوگا جو حیاء کی حفاظت کر رہی ہے اسے غامدی صاحب وہ حیلے، بہانے، رخنے، چور دروازے، نفس کے پوشیدہ اور شریر تقاضے، طریقے، سلیقے، قرینے، ضابطے رابطے راستے اور واسطے بتائیں گے جن کے ذریعے وہ حیاء سے آزاد ہو حجاب ختم کر دے اور آوارہ بن جائے غامدی صاحب اور تمام جدیدیت پسندوں کا طریقہ واردات یہی ہے تنہائی میں آپ غامدی صاحب سے آج کل کی جدیدیت عورت جدید موسیقی کے بارے میں پوچھئے اس کی بھرپور مذمت کریں گے اسلام میں اس کی اجازت نہیں جس کی اجازت نہیں ہے اس کے خلاف قلم تحریر تقریر کیوں خاموش ہے؟ موسیقی کی اجازت دیں گے ساتھ میں یہ بھی فرمائیں گے کہ اشعار پاکیزہ ہوں جنسی آوارگی نہ ہو لیکن کبھی موجودہ موسیقی کو حرام قرار نہیں دیں گے۔ کسی نے غامدی صاحب سے پوچھا کہ اگر موسیقی اور پاپ موسیقی یا کلاسیکل موسیقی کے ساتھ کلام پاک کو گا بجا لیا جائے تو کیا ہرج ہے کیونکہ آپ نے موسیقی کے ساتھ پاکیزہ کلام کی شرط لگائی ہے اور سب سے پاکیزہ کلام۔ اللہ کا کلام ہے اور آپ نے ایک تقریر میں خود یہ فرمایا ہے کہ حضرت داؤد زبور کی آیتیں موسیقی پر گاتے تھے اور انجیل مقدس کی آیتیں کلیسا میں بربط و نے پر گائی جاتی ہے تو کلام اللہ کو موسیقی پر گانے میں کیا ہرج ہے تو حضرت والا نے فرمایا کہ میں نے اس موضوع پر کبھی غور نہیں کیا اس لئے فی الحال حتمی جواب نہیں دے سکتا لیکن اس امر میں بہ ظاہر کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا لیکن احتیاط بہتر ہے کیونکہ قرآن کو بربط پر گانے سے اس کا تقدس مجروح ہو سکتا ہے۔

احادیث سے جس گانے اور موسیقی کو غامدی صاحب ثابت کر رہے ہیں اس کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر امت کے لوگ خوشی کے موقع پر اپنے صلحاء، صدیقین، شہداء کو دف پر یاد کر لیں تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن ایسی شاعری اور ایسی موسیقی کو تو مغرب موسیقی ہی نہیں مانتا جس سے جنسی جذبات میں ابال ابھار اور اشتعال نہ آئے اور تمام حدود توڑنے کی آرزو پیدا نہ ہو لہٰذا غامدی

صاحب مغربی موسیقی پر غض بصر سے کام لیتے ہیں یہ جدیدیت پسندوں کا خاص طریقہ واردات ہے۔ اسلامی تاریخ وتہذیب میں کبھی موسیقی اور غنائیت کو ریاستی معاشرتی، حکومتی، اخلاقی، اجتماعی سرپرستی حاصل نہیں رہی موسیقی کو شجر ممنوعہ سمجھا گیا دور زوال میں بھی اگر موسیقی کو رندوں اوراوباشوں کی نجی محفلوں اور چار دیواریوں میں زندگی کا چلن ملا تب بھی موسیقاروں گویوں کو کبھی معاشرے میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ انھیں حقیر اور ذلیل مخلوق سمجھا گیا۔ ناچنے گانے والی عورتوں کو ایک تماشے کے طور پر قبول کیا گیا وہ کبھی اشرافیہ میں شامل نہ ہوسکیں اورنگ زیب کے دور میں بھی موسیقاروں اور گویوں کے محلے سب سے الگ ہوتے تھے۔ یہ معاشرے میں اچھوت بن کر زندہ رہتے تھے کوئی انھیں شرفاء میں شمار نہ کرتا تھا حتی کہ وہ شرفاء جو ان کی موسیقی وغنا سے لطف اندوز ہوتے تھے یہ کام چھپ کر کرتے تھے تا کہ ان کی شرافت پر دھبہ نہ آجائے۔ ۱۹۸۰ء تک طوائفیں الگ آبادیوں محلوں میں رہتی تھیں بھٹو صاحب نے اس سلسلے میں قانون سازی کی تو یہ طوائفیں شرفاء کے محلوں میں رچ بس گئیں اور اب شرفاء میں شامل ہیں تاریخ میں پہلی مرتبہ جاوید غامدی وہ پہلے مفکر ہیں جو اوباشوں آوارہ لوگوں، لچوں اور لفنگوں کی ناپسندیدہ حرکات وسکنات کو اسلامی جواز عطا کر رہے ہیں یہ جواز بھی مختلف تحدیدات کے دائرئے میں دیا جا رہا ہے۔ اور غامدی صاحب کو جرأت نہیں ہے کہ اس قدر آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی ٹی وی چینلوں، ریڈیو اور کنسرٹ میں برپا کی جانے والی محافل موسیقی اور دلوں میں آگ بھڑکانے والے گانوں اور نغموں کو حلال قرار دے لیں ایسے مواقع پر حضرت سکوت فرماتے ہیں یہ جدیدیت پسندوں کا خاص طریقہ واردات ہے کہ اگر کوئی بے پردہ آوارہ عریاں ہے تو اسے کچھ نہ کہو اس کو ہدایت جاری نہ کرو اس کی اصلاح کے لئے فکر مند نہ ہو نقد نہ کرو لیکن جس نے نقاب پہن رکھا ہے اس کا نقاب اتروادو اس کی اصلاح کردو اسے باور کرادو کہ یہ ظلم ہے اس اضافی بوجھ کو اتار پھینکو جو پاپ موسیقی سن رہا ہے عریاں فحش گانے گا رہا ہے اس پر کوئی نقد نہ کرو جو موسیقی نہیں سن رہا اسے اکسایا جائے کہ وہ موسیقی سنے یہ روح کی غذا ہے تم خشک مولوی اور کھردری ملانی کیوں بنی ہو موج مستی سے دل بہلاؤ یہ تو تمہارے رب کی عنایت اور تمہارے پیغمبر کی سنت ہے نعوذ باللہ دوسرے لفظوں میں غامدی صاحب اور تمام جدیدیت پسندوں کے اصل مخاطب جدیدیت پسند، بگڑے ہوئے، صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے مسلمان نہیں ان کے اصل مخاطب راسخ العقیدہ دینی لوگ ہیں جنہیں یہ صراط مستقیم سے بھٹکا ہوا سمجھتے ہیں اور اصلاً تمام توجہ انھیں صراط مستقیم سے بھٹکانے پر مرکوز کرتے ہیں اسی

لئے یہ بگڑے ہوئے مسلمانوں کو درست اور حق پر سمجھتے ہیں لیکن ان مسلمانوں کو جو صراط مستقیم پر چل رہے ہیں بھٹکانا اپنا مذہبی فریضہ خیال کرتے ہیں۔تمام جدید یت پسندوں Modrenist کا بنیادی کام یہی ہے کہ اسلامی معاشروں میں دین پر کاربند لوگوں کو تذبذب، شک، قیاس، گمان کی دھند میں مبتلا کر کے ان سے ایمان عمل یقین کی دولت چھین لیں یہ جدید یت پسند کبھی گمراہ لوگوں کی اصلاح کے لیے نہ قلم اٹھائیں گے نہ زبان ہلائیں گے ان کا ہدف ہمیشہ دین پر عمل کرنے والے ہوں گے کیونکہ جو دین پر عمل نہیں کرر ہے وہ تو نجات یافتہ ہیں صراط مستقیم پر گامزن ہو چکے ہیں جو دین پر عامل ہیں وہ اصلاً بھٹکے ہوئے ہیں لہٰذا بھٹکے ہوئے آ ہو کو سوئے حرم جانے سے روکنا جدید یت پسندوں کی استعماری حکمت عملی ہے۔اسی لئے ٹی وی ریڈیو کی عریانی فحاشی اور ملک بھر میں بڑھتی ہوئی بے حیائی پر جاوید غامدی اور ان کے حلقہ احباب کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں آتا البتہ خوشی سے مسرت کے قطرے پلکوں پر جگمگاتے ہیں۔

جاوید غامدی کی انگریزی شاعری: سرقے کا عالمی شاہکار

''مقامات'' کی چار انگریزی نظموں کا تجزیہ

[پہلی قسط]

جاوید غامدی صاحب اسلام پر طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ انگریزی میں شاعری کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ اس شوق کا اظہار ان کی کتاب ''مقامات'' کے آخر میں ص ۱۷۹ تا ص ۱۸۲ چار انگریزی نظموں کے ذریعے ہوا۔ یہ چار نظمیں جو صرف ۶۴ مصرعوں پر مشتمل ہیں ان کی ردی شاعری کی زنبیل کے ''چنیدہ خوشے'' ہیں لیکن ان خوشوں میں نہ رس ہے، نہ خوشبو نہ لذت نہ رنگ نہ موسیقیت نہ غنائیت، نہ شعریت نہ بلندی خیال ان کی شاعری بھی ان کے افکار کی طرح ژولیدہ، پژمردہ اور بے ہودہ ہے۔ ان نظموں میں اظہار کا پیرایہ یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ ان سالوں میں لکھی گئی ہیں جو ان نظموں کے ذیل میں درج ہیں۔ یہ ان نظموں کی Lack of Originality کو ظاہر کرتی ہیں۔ جگہ جگہ کلاسیکی انگریزی شعراء کے مصرعے [Lines] اٹھا لیے گئے ہیں جنھیں معمولی ردوبدل [Mould] کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ شاعر نے شاید انگریزی شاعری تو کہیں کہیں سے پڑھی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اس زبان میں اظہار کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اسی طرح یونانی دیو مالا کا استعمال بھی بے جا نظر آتا ہے۔ متروک [Arclaic] الفاظ کا استعمال جیسے thou, art وغیرہ بھی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ تحریریں جنھیں اگر نظمیں کہا جائے تو زبردستی کی ہیں۔ غنائیت موسیقیت اور سلاست و روانی سے محروم۔ سوال یہ ہے کہ جب غامدی صاحب کو عربی نہیں آتی تو عربی زبان میں کیوں لکھتے ہیں اسلام کو نہیں جانتے تو اسلام پر طبع آزمائی کیوں کرتے ہیں اور انگریزی نہیں آتی تو انگریزی میں شاعری کیوں فرماتے ہیں، غامدی صاحب نے کیٹس اور شیکسپیئر کے مصرعوں پر دھڑلے سے ہاتھ صاف کیا ہے۔ اس کی واحد وجہ تملق، تکبر، تصنع، تعقر، غرور کہ میں کئی زبانوں کا ماہر ہوں، عوام تو جاہل ہوتے ہیں خواص بھی اجہل ہیں کسی نے ان کی بے ربط سرقہ شدہ شاعری کو محسوس نہیں کیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غامدی صاحب کی کتابیں کوئی پڑھتا نہیں یا پڑھتا ہے تو غور نہیں

کرتا۔

جاوید غامدی صاحب کی کل چار نظموں کی شاعری مشہور انگریزی نظموں کے مصرعوں کے جوڑ توڑ پر مشتمل ہے۔ بیشتر مقامات پر انگریزی شعراء کی تراکیب پر بلا تکلف ہاتھ صاف کیا گیا ہے اور کچھ جگہ تو پوری پوری سطریں نہایت معمولی ردوبدل کے ساتھ سرقہ کرلی گئی ہے۔

غامدی صاحب نے ''مقامات'' میں کل چونسٹھ مصرعوں پر مشتمل انگریزی شاعری شائع کی تھی جس میں سے ۸ مصرعے سرقے پر مشتمل ہیں۔ کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔ ہماری تحقیق جاری ہے۔ انشاء اللہ مزید سرقہ شدہ مصرعوں کا ثبوت بھی انگریزی ادبیات سے مل جائے گا۔ سرقہ شدہ مصرعے ملاحظہ فرمایے۔

۱۔ غامدی صاحب

As *though* of *venom* I *had drunk,* I *feel!*

۱۔ Keats :

As *though* of *hemlock* I *had drunk*

[Ode to *a* Nightangale]

۲۔ غامدی صاحب:

Of *love amid the cheating elves' romance:*

[Cheating elves کی ترکیب Keats سے سرقہ کی گئی ہے]

۲۔ Keats:

As *she* is *famed* to do, deceiving elf.

[Ode to *a* Nightingale]

۳۔ غامدی صاحب

To the Arabian Lord, *ay,* I *will fly* to *thee*

۳۔ Keats:

Away! *away!* for I will fly to thee

[Ode to a Nightangale]

۴۔غامدی صاحب

Of solitude of the beauteous eve's choir;

:Words Worth۔۴

It is a beauteous evening calm and free

۵۔غامدی صاحب

Shall I compose an elegy on thy death,

:Shakespeare۔۵

Shall I compare thee to a summer's day

۶۔غامدی صاحب

The eve! Gnats mourn in a deep-delved hole:

:Keats۔۶

Then in a wailful choir the smallgnats mourn

[Ode to Autumn]

۷۔غامدی صاحب

Hark! Lips of beauty never canst thou kiss,

:Keats۔۷

Bold lover, never, never, never canst thou kiss

[Ode on a Grecian Vrn]

۸۔غامدی صاحب

Ay, palsied like the vales of Arcady -

:Keats۔۸

Of deities or mortals, or of both, In Tempe' or the dales of Arcady:

[ایضاً]

غامدی صاحب کی شخصیت کو اگر جدید انگریزی اصطلاح میں بیان کیا جائے تو وہ Triggerhappy نظر آتے ہیں جو عجلت کے ساتھ ہمہ وقت ہر ایک پر وار کرنے کے لیے تیار رہتا ہے مقصد صرف معرکہ آرائی ہوتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں کہ، ہر وقت گرمئی محفل کا کچھ سامان موجود رہے۔

غامدی صاحب کی بے تکی، مضحکہ خیز شاعری Percy Wyndham Lewis کی مرتبہ کتاب The Stuffed owl میں بھی شامل کرنا ممکن نہیں جس میں بُرے بُرے انگریزی اشعار کا نہایت برا مگر نادر انتخاب کیا گیا تھا کیونکہ غامدی صاحب کی انگریزی شاعری بہت بری ہے اسے شاعری تو کہا نہیں جاسکتا اور سرقہ کہنا بھی سرقے کی توہین ہے کہ انھیں سرقے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ سرقہ بھی بڑے نامی گرامی شعراء کا کیا ہے اس طرح کے سرقے کے لیے بڑے حوصلے ہمت اور جی داری کی ضرورت ہے۔ غامدی صاحب کی جی داری کا عالم یہ ہے کہ انھوں نے امت کے صحابہ، ائمہ، فقہا، علماء کا خیال نہیں کیا تو انگریزی شعراء کی کیا حیثیت۔

غامدی صاحب کا علمی کام ان کی لغو، بے ہودہ انگریزی شاعری ان کی بے ربط، بے سروپاء، رکیک، بھونڈی، مہمل عربی انشاء پردازی، ان کے نادر افکار و خیالات ان کے چونکانے والے ارشادات امریکہ میں ۱۹۵۰ء میں تخلیق پانے والے نئے محاورے Strictly for the birds کے عین مطابق ہیں جس سے بندہ درہم و دینار ہی نہیں نفس پرست پرندے اور چرندے بھی بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء سے وہ مسلسل کینچلی بدل رہے ہیں۔ ہر سال دو سال بعد ان کا چولا بدل جاتا ہے۔ پیرہن تبدیل ہوجاتا ہے، ملبوس اتر جاتا ہے اور نئے رنگ بکھرنے لگتے ہیں ان کے علم کا انجام کیا ہوگا اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے ۹ رفروری ۱۸۹۳ کو پیرس کے Moulin Rouge میں نوجوانوں کے اس طرز عمل کو یاد کیا جائے جس کے تتمّہ کے طور پر Striptease کی اصطلاح ایجاد ہوئی جس نے فرانس کی اخلاقی، مذہبی وثقافتی زندگی کو تہہ و بالا کرڈالا۔ غامدی صاحب کا اصل چہرہ کب واضح ہوسکے گا اس کے لئے بہت انتظار کرنا ہوگا معلوم نہیں ہماری زندگی میں غامدی صاحب کو Moulin Rouge میسر آسکے گا یا نہیں جہا

ں ان کی حقیقت کھول دی جائے گی یا وہ خود حقیقت کھول دیں گے اور حشر سے پہلے زمین پر ان کے لئے حشر برپا ہو جائے گا ابھی تو وہ پیاز کی مانند اپنے چھلکوں کی پرتیں رفتہ رفتہ اتار رہے ہیں۔ان کی اصل شخصیت، تک رسائی کے لئے الف لیلہ کا انتظار کرنا ہوگا۔

غامدی صاحب کا کمال یہ ہے کہ ان کے مکتب فکر نے ہم جنس پرستی کو ایک فطری، جبلی عمل قرار دے کر انگریزی محاورے swing both way کی اسلام کاری کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔

غامدی صاحب کا واحد وصف انگریزی روزمرہ میں Verbal Diarrohea ہے اپنے آگے کسی کو بولنے نہ دینا بے معنی گفتگو کرتے رہنا جن موضوعات کی ابجد سے ناواقف ہیں مثلاً معیشت، بینکاری، مغرب، سائنس وٹیکنالوجی ان پر بڑے طمطراق سے گفتگو کرنا۔مغرب نے عالم اسلام کے لئے المورد کی شکل میں Domsday Machine مہیا کر دی ہے جو تابکاری پھیلاتی رہے گی اس چرب زبانی کے ذریعے وہ عالم اسلام میں مغرب کی طرح Maure Decade برپا کرنے کی مسلسل جدوجہد میں مصروف ہیں۔

یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے کہ ٹی وی اور میڈیا کی شہرت انگریزی محاورے میں صرف پندرہ منٹ کی شہرت ہوتی ہے۔Famous for 15 minites ایک زمانے میں جب ایک ہی ٹی وی تھا شاہ بلیغ الدین کی تقریر روشنی، ڈاکٹر اسرار کا درس قرآن الھدّی، امجد اسلام امجد کا ڈرامہ وارث، نسیم حجازی کا ناول آخری چٹان، شوکت صدیقی کا خدا کی بستی، طنزیہ مزاحیہ سلسلہ الف نون کمال رضوی اور ننھا پاکستان کے واحد ٹیلی ویژن کے ذریعے نشر ہوتے تھے ہر گلی ہر محلے میں ایک ہی آواز گونجتی تھی اور اس گونج کے دوران گلیاں محلے سنسان اور ویران رہتے تھے اگلے دن ہر دفتر، ہر چوپال، ہر مجلس اور ہر فرد کی زبان پر ایک ہی شخص، ایک ہی بات، ایک ہی تقریر، ایک ہی ڈرامہ اور ایک ہی مکالمہ ہوتا تھا لیکن آج اس عہد کے زندہ لوگوں سے ان معزز و محترم لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے جواب قصہ پارینہ بن گئے ہیں تو کسی کو یاد بھی نہیں ہے کہ ہاں واقعی تب انہی لوگوں کا راج گلی محلے سے بازار تک تمام خلق پر تھا۔شاہ بلیغ الدین ہر سال کنیڈا سے کراچی تشریف لاتے ہیں لیکن انہیں کوئی نہیں پہچانتا ایک شخص جو کل تک اس معاشرے میں اتنا مقبول تھا اچانک اس معاشرے کے لئے اتنا اجنبی ہو گیا یہی پندرہ منٹ کی شہرت ہے۔ پندرہ منٹ کی

یہ شہرت ٹی وی کے ذریعے کسی کو بھی مل سکتی ہے لیکن یہ شہرت کوئی بنیاد نہیں رکھتی۔

وہ دن دور نہیں ہے جب غامدی صاحب اور ان کا مکتبہ فکر برطانوی اصطلاح Misper کی مانند دھندلکوں میں گم ہو جائیں گے ان کی گمشدگی کی ایف آئی آر درج کرانے والا بھی کوئی نہ ہوگا تاریخ میں عبداللہ چکڑالوی کا نام ابھی زندہ ہے لیکن ان کے مکتبہ فکر کی کوئی مسجد موجود نہیں ایک مسجد انہوں نے زندگی میں بنائی تھی لیکن موت کے فرشتے نے بساط زندگی لپیٹ دی تو یہ مسجد راسخ العقیدہ مسلمانوں کے گروہ کے زیر انتظام آ گئی جدیدیت پسند مسجد سے کوئی تعلق نہیں رکھتے یہ اسلامی تاریخ کے فطری اداروں مسجد، مدرسے سے بہت فاصلے پر رہتے ہیں کیونکہ مسجد بنانا، اسے آباد رکھنا، اس کے انتظامات کرنا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فجر میں اذان دینا اور نماز فجر کا اہتمام کرنا جدیدیت پسندوں کے لئے ممکن ہی نہیں ہے جسٹس جاوید اقبال، ڈاکٹر رشید جالندھری، ڈاکٹر منظور احمد، جدید اسلام پر تقریر کر سکتے ہیں لیکن یہ جدید مولوی نہ علی الصباح اٹھ سکتے ہیں نہ فجر کی اذان دے سکتے نہ جماعت کی امامت کر سکتے نہ نظم جماعت قائم کر سکتے ہیں لیکن ٹی وی پر دانشوری بگھار کر امت کی امامت سنبھالنے کے درپے ہیں جو امامت صغریٰ کے اہل نہیں وہ امامت کبریٰ کے لئے بھی نا اہل ہیں۔ انیسویں صدی کے...... جدیدیت پسند مولوی چراغ علی کا حال سب کو معلوم ہے جو کئی زبانیں جانتے تھے اور غامدی صاحب کے مقابلے میں بہت بڑے آدمی تھے لیکن نہ ان کی اولاد کا پتہ ہے نہ یہ پتہ ہے کہ ان کا آخری نشان کس سرزمین میں محفوظ ہے ان کا خاندان اولاد سب کچھ معمہ بن کر رہ گیا ہے غامدی صاحب بہرحال چراغ علی سے بڑے جدیدیت پسند نہیں ہیں۔

دیکھیے وہ دن کب آئے گا جب غامدی صاحب ان اعتراضات کا جواب دیں ہمارے خیال میں امریکی جملے That'll be the day کے مطابق وہ دن کبھی نہیں۔ کبھی نہیں آئے گا۔

یہ بات ہم اس لیے لکھ رہے ہیں کہ غامدی صاحب نے ساحل کے اپریل والے خط کے جواب میں لکھا ہے کہ ”آپ اپنا کام کریں میں اپنا کام کر رہا ہوں فیصلہ تاریخ کرے گی“ جب دلیل، بحث، مباحثے، مکالمے میں غامدی صاحب کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا تو فوراً معاملہ تاریخ کے سپرد کر دیا گیا۔ حالانکہ ہم نے صرف یہ پوچھا تھا کہ غامدی لفظ کا درست مطلب کیا ہے اور آج کل آپ کس موقف پر قائم ہیں دوسرے خط میں ان سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ پانچ مئی تک ساحل اپریل کا جواب دینا چاہیں تو

ساحل حاضر ہے اس کا کوئی جواب ابھی تک نہیں ملا اور شاید اب کبھی نہ مل سکے۔

جاوید غامدی: سرقہ بازوں کی فہرست میں ایک اہم اضافہ

مشرق و مغرب میں جب بھی سرقہ بازی کی تاریخ لکھی جائے گی اس میں علامہ نیاز فتح پوری، حافظ اسلم جیراج پوری، غلام احمد پرویز، ڈاکٹر احمد امین مصری، امین احسن اصلاحی اور جاوید احمد غامدی جیسے منکرین حدیث کے سرقے سب سے نمایاں طور پر نظر آئیں گے یہ عجیب اتفاق ہے کہ تمام منکرین حدیث سرقہ بازی میں کمال رکھتے ہیں اور سرقہ بازی کی صفت تمام جدیدیت پسند گروہوں کا مشترکہ وصف ہے سرقہ بازوں کی اس فہرست میں جاوید غامدی کے شعری، ادبی، فکری، علمی سرقے فن سرقہ میں ان کی جامعیت اور کمالِ فن ظاہر کرتے ہیں اس معاملے میں دبستان شبلی کے بزعم خود وارث اور مسند نشین جدید و قدیم علوم کے جامع جناب جاوید غامدی صاحب کا تمام علم و فضل مشرق و مغرب کے مختلف مفکرین اور محققین کے افکار و خیالات کے سرقوں سے کشید کردہ ہے۔

[۱] زکوٰۃ پر ان کا موقف ادارہ تحقیقات اسلامی کے سابق صدر ڈاکٹر فضل الرحمان کا چربہ ہے۔ [۲] قانون میراث پر ان کا موقف مولانا ابوالجلال ندوی کے مضمون میراث اور احمد دین امرتسری کی اردو کتاب الوراثت فی القرآن اور اس کتاب کے عربی سرقے الوراثت فی الاسلام مصنفہ علامہ اسلم جیراج پوری کا کامل سرقہ ہے۔ [۳] زکوۃ اور میراث پر غامدی صاحب کے سرقوں کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے مولانا ابوالجلال ندوی کی کتاب ربوٰ، زکوٰۃ اور ٹیکس ملاحظہ کیجیے جو سویدا مطبوعات نے ۲۰۰۶ء میں شائع کی ہے یہ کتاب کتاب سرائے لاہور اور فضلی سنز کراچی پر دستیاب ہے اس کتاب کے مضامین زکوٰۃ کیا ٹیکس کیا؟ آئین میراث میراث کلالہ وغیرہ غامدی صاحب کے سرقوں کی کہانی سنا دیں گے ابوالجلال ندوی کے میراث پر مضامین غامدی صاحب کی پیدائش سے صرف ایک سال پہلے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئے تھے۔ [۴] قرآن سے مختلف فقہی مسائل کا استنباط اصلاً عمر احمد عثمانی اور علامہ طاہر مکی کی کتاب فقہ القرآن کے دلائل، آثار اور امثال کی خوبصورت نقل ہے جس پر اکثر اصل کا گمان ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات یہ چربہ اصل سے بڑھ کر لگتا ہے۔ [۵] رجم پر غامدی صاحب کی تمام تحقیق اور تکبر، تملق و تفرد اور اصرار اصلاً فقہ القرآن کی ایک جلد حقیقت رجم کا سرقہ ہے۔ [۶] غامدی صاحب کے بیشتر فقہی استنباط فقہ القرآن سے

ماخوذ ہیں اسی لیے غامدی صاحب کے اشراق میں آج تک فقہ القرآن پر کبھی تبصرہ شائع نہیں کیا گیا تا کہ قارئین کہیں اصل ماخذ مرجع تک رسائی حاصل کر کے ان کی علمیت کے مراجع و مصادر سے واقف نہ ہو جائیں۔[۷] فقہ القرآن کے مولف عمر احمد عثمانی اور اس کے اصل محرک و مرتب مفتی علامہ طاہر مکی [سابق مشیر مذہبی امور خالد اسحاق] کی روایت کے مطابق جو مرحوم ہفت روزہ وجود کے مدیر محمد طاہر کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، فقہ القرآن کی تمام جلدیں تین مرتبہ اشراق کو بھیجی گئیں لیکن کبھی تبصرہ نہیں کیا گیا آخری مرتبہ ۱۹۹۸ء میں ہفت روزہ تکبیر کے صحافی اور وجود کے مدیر محمد طاہر نے فقہ القرآن کی تمام جلدیں دانش سراء میں معز امجد کے سپرد کیں انھوں نے وعدہ کیا لیکن دس سال گزر گئے تبصرہ نہیں کیا گیا۔[۸] رجم کا سورہء مائدہ سے اثبات و استدلال حمید الدین فراہی کے موقف کا اعادہ ہے،[۹] میزان کے کئی صفحات امین احسن اصلاحی کا لفظ بہ لفظ سرقہ ہیں۔[۱۰] البیان کے نام سے غامدی صاحب کا ترجمہ قرآن حمید الدین فراہی اور ابو الجلال ندوی کے تراجم سے ماخوذ ہے۔[۱۱] امت عیسوی و موسوی کے بارے میں غامدی صاحب کا نقطۂ نظر کہ یہود و نصاریٰ جنتی ہیں جو بھی توحید کا اقرار کرتا ہے اور نیک عمل وہ جنتی ہے رسالت محمدی پر ایمان لانا ضروری نہیں وحدت ادیان قرآن سے ثابت ہے جن یہودیوں نصرانیوں سے قرآن نے ترک موالات کا حکم دیا وہ خاص جزیرۃ العرب کے تھے آج کے نہیں غامدی صاحب کا تازہ ترین نقطۂ نظر وحدت ادیان کے عالمی مکتبہ فکر روایت کے بانی رینے گینوں کا تتبع اور مارٹن لنگز کے مضمون WITH ALL THY MIND کا ہو بہو سرقہ ہے۔[۱۲] سنت دین ابراہیمی کی روایت کا ملحدانہ استدلال جواد علی کی کتاب ''المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام'' کی معلومات سے سرقہ کیا گیا ہے اور اس کے حوالوں کی بنیاد پر غامدی صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دین تو تمام تر ماضی میں حضرت آدم کے ساتھ تواتر و تسلسل سے چلا آرہا ہے لہٰذا سنت تو ابتدائے آدم یعنی ابتدائے آفرینش سے موجود ہے لہٰذا سنت مقدم ہے قرآن موخر ہے لہٰذا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص نہیں،[۱۳] بنوامیہ اور بنو عباس کی تاریخ واقعہ کربلا اور شہادت حضرت حسینؓ نواسہ رسالت مآبؐ کے واقعات پر مبنی تاریخ سے انکار کا نقطہ نظر خود غامدی صاحب کا تحقیقی نقطۂ نظر نہیں ہے ہفت روزہ زندگی کو انٹرویو میں انھوں نے تاریخ اسلام اور شہادت حسینؓ کے سلسلے میں جو منفرد اور نیا نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ واقعہ کربلا سے متعلق موجود تمام تاریخی شہادتیں غلط ہیں اور واقعہ کربلا افسانہ ہے۔ حضرت حسینؓ کو خلافت بنوامیہ نے نہیں بلکہ انہی کے

ساتھ آنے والے قافلے نے شہید کیا۔ یہ نقطۂ نظر تاریخی دلائل کے ساتھ حکیم محمود احمد عباسی، حکیم علی احمد عباسی، مولانا حبیب الرحمان کاندھلوی اور مفتی طاہر مکی صاحب بیان کر چکے ہیں اور پاکستان سنی کونسل کے زیر اہتمام کراچی کے خالق دینا ہال میں دس سال تک ہونے والے محاضرات میں یہ موقف علامہ مفتی طاہر مکی کی علمی سرپرستی میں بار بار بیان کیا گیا ہے لہٰذا یہ موقف بھی علامہ طاہر مکی اور سنی کونسل کے محاضرات کا سرقہ ہے۔ [۱۴] حضرت عائشہؓ کی عمر کے سلسلے میں غامدی صاحب کا موقف حکیم نیاز احمد کی کتاب کا حرف بہ حرف چربہ ہے۔ [۱۵] غامدی صاحب کی انگریزی شاعری جو چار نظموں اور چونسٹھ مصرعوں پر مشتمل ہے شیکسپیئر اور کیٹس کے مصرعوں کا چربہ ہے۔ [۱۶] شرح شواہد الفراہی میں فراہی صاحب کا سرقہ کیا گیا ہے۔ اپریل کے شمارے میں تفصیل موجود ہے۔ [۱۷] غامدی صاحب کی کتاب اصول و مبادی میں منحل اور مصنوع کلام جاہلیت کی بحث ظہیر اصلاحی غازی کے مضمون ''مولانا فراہی کی تفسیر کے اصول'' کے تین صفحات کا حرف بہ حرف لیکن غلط سرقہ ہے۔ غامدی صاحب عجلت میں درست حوالے نقل کرنا بھول گئے۔

اشراق میں شائع ہونے والے درج ذیل مضامین کے اکثر صفحات، الفاظ اور دلائل یا تو ڈاکٹر فاروق کی اسلام کیا ہے کا سرقہ ہیں یا یہ مضامین غامدی صاحب کے شاگردوں نے ایک دوسر کے مضامین سے وقتاً فوقتاً سرقہ کیے ہیں۔

اصول دین	نادر عقیل انصاری	مارچ ۹۴	۲۶
حدیث و سنت میں فرق	ساجد حمید	مئی	۱۲
عورت کی گواہی	معز امجد	دسمبر	۱۸

اب یہ معلوم نہیں کہ غامدی صاحب نے ڈاکٹر فاروق خان کا سرقہ کیا ہے یا ڈاکٹر فاروق خان، ساجد حمید، معز امجد اور نادر عقیل نے غامدی صاحب کا سرقہ کیا ہے۔ شاگردوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن الاستاذ غامدی تو بلاشبہ مسلمہ سارق ہیں ہم اب تک نیاز فتح پوری کو برعظیم پاک و ہند کا سب سے بڑا سرقے باز سمجھتے تھے لیکن اب معلوم ہوا کہ ان کا چراغ غامدی صاحب کے سامنے نہ جل سکے گا۔

۱۹۹۴ مارچ کے اشراق میں ماخذات دین کی بحث ''اصول دین'' کے نام سے نادر عقیل

انصاری کے قلم سے ص ۲۶ تا ۳۶ پر محیط ہے۔ نادر عقیل حکومت پنجاب کے اہم محکمے کے ڈپٹی سکریٹری ہیں ایام طالب علمی کا یہ مضمون غامدی صاحب یا ڈاکٹر فاروق خان کا سرقہ و چربہ ہے۔ اس بحث کے تمام الفاظ دلائل آیات احادیث حرف بہ حرف، لفظ بہ لفظ غامدی صاحب کے موقف کا سرقہ چربہ بازگشت اعادہ تکرار نقل عکس ہیں ''خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن دین اسلام کا پہلا ماخذ ہے قرآن کے علاوہ نبیؐ سے یہ دین ہمیں دوصورتوں میں ملا ہے [۱] سنت ثابتہ، [۲] حدیث۔ ثبوت کے اعتبار سے سنت میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں جس طرح وہ قولی تواتر سے ثابت ہے اسی طرح یہ عملی تواتر ثابت ہے چنانچہ اس کے بارے میں اب کسی بحث اور نزاع کی گنجائش نہیں ہے احادیث کے متعلق صحیح طرز عمل یہ ہے کہ وہ قرآن مجید سنت ثابتہ اور عقل وفطرت کی اساس پر قائم ہوں اور کسی پہلو سے ان کے منافی نہ ہوں۔ اس صورت میں ان احادیث کی حجیت بھی مسلم ہے اور ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔''

ساجد حمید نے مئی ۱۹۹۴ء میں ص ۱۲ پر حدیث وسنت میں فرق کے زیر عنوان غامدی صاحب اور نادر عقیل انصاری کے موقف کا حرف بہ حرف چربہ فرمایا ہے لکھتے ہیں ''سنت ہم تک عملی تواتر کے ذریعے سے ایسے ہی پہنچی ہے جس طرح قرآن ہمیں قولی تواتر سے ملا ہے اس وجہ سے ان دونوں کے بارے میں بحث ونزاع کی کوئی گنجائش نہیں ہے حدیث وسنت کے اسی فرق کی وجہ سے اس امت کے اکابر نے ہمیشہ حدیث کو سنت متواترہ کے بعد تیسرا بڑا ماخذ مانا ہے اور اسے ہمیشہ سنت متواترہ سے الگ رکھا ہے۔

اسلام کے تصور نجات سے انحراف کر کے وحدت ادیان، صرف توحید پر ایمان کافی قرار دینے کا فلسفہ اور اس سے ملتے جلتے نظریات یا ارتقاء کے سلسلے میں جاوید غامدی صاحب کے تازہ ترین انحرافات، افادات، ارشادات ماثرات دراصل مارٹن لنگز کی ایک انگریزی تحریر With All Thy Mind سے حرف بہ حرف سرقہ ہیں اس کتاب کی تردید میں اشراق ۱۹۹۴ء اپریل، مئی، جون میں تین قسطوں میں ڈاکٹر محمد امین نے مضمون لکھا تھا کیوں کہ غامدی صاحب اس وقت مکتبہ روایت کو گمراہ مکتب سمجھتے تھے اور اس کے کفر کا انکار ضروری قرار دیتے تھے لہٰذا ڈاکٹر امین کا مضمون ''اسلام کا تصور نجات'' غامدی صاحب کی تائید وتصویب سے شائع ہوا تھا لیکن اب غامدی صاحب نے سہیل عمر صاحب کے زیر اثر مکتب روایت کی گمراہی وحدت ادیان کو قبول کرلیا ہے۔ مارٹن لنگز نے اس تحریر میں جوڑ توڑ کے ذریعے یہ ثابت

کرنے کی ناکام کوشش تھی کہ سورہ توبہ کی آیت ۳۳ دین الحق ...... علی الدین ...... المشرکون کی تفاسیر غلط ہیں۔ اس آیت میں مشرکین سے مراد اہل کتاب نہیں بلکہ بت پرست ہیں دین سے مراد صرف اس خطے ادیان کے تمام دین ہیں سارے صحیح ادیان اسلام ہی ہیں عیسائیت اور بدھ مت کی طرح اسلام بھی ایک عالمی دین ہے نیکی بہرحال نیکی ہے خواہ کوئی کرے لہٰذا نجات اخروی کو صرف کسی ایک مذہب کے ماننے والوں تک محدود کرنا غلط ہے کسی خاص نبوت پر ایمان لانا ضروری نہیں جو کوئی بھی اللہ، یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے نجات پائے گا عیسائی یہودی بھی جنت میں جا سکتے ہیں الحمد اللہ غامدی صاحب ان سرقہ شدہ خیالات کو آج کل اپنے نام سے پیش کر رہے ہیں۔

تزکیہ نفس روحانی وجود اخلاقی وجود وغیرہ کے موضوع پر غامدی صاحب کی تین مشہور تقاریر امین احسن اصلاحی کی کتاب تزکیہ نفس کا چربہ ہیں۔ یہ تقاریر طالب محسن نے ۱۹۹۴ء کے اشراق میں شائع کی تھیں۔

دسمبر ۱۹۹۴ء میں معزامجد کا مضمون عورت کی گواہی غامدی صاحب کے سلسلہ محاضرات حدود و تعزیرات کا لفظ بہ لفظ سرقہ ہے یا بصورت دیگر غامدی صاحب کے افکار معزامجد کے خیالات کا ہو بہو چربہ ہیں۔

۱۹۹۴ دسمبر کے اشراق میں ص ۳۴ پر معزامجد کا سنت کے بارے میں موقف غامدی صاحب یا ڈاکٹر محمد فاروق کا سرقہ ہے۔ الفاظ ملاحظہ کیجیے ''سنت دین کا مستقل ماخذ ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی شارح بھی ہے سنت کو یہ حیثیت کسی عالم فقیہہ یا مجتہد نے نہیں دی بلکہ اس عالم کے پروردگار ہی نے دی ہے چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے النحل ۱۶: ۴۴ اور ہم نے تم پر [محمدؐ] بھی یہ ذکر اتارا ہے تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو واضح کر دو جوان کی طرف نازل کی گئی ہے چنانچہ جو شخص جب تک صاف صاف قرآن کا انکار نہ کر دے اس کے لیے سنت کی اس حیثیت کو چیلنج کرنا ممکن نہیں ہے۔ لفظ تبیین کے کیا معنی ہیں تبیین کا لفظ کسی معاملے کی حقیقت کو کھول دینے کسی کلام کے مدعا کو واضح کر دینے کسی چیز کے خفاء کو دور کر کے اسے منصہ شہود پر لانے کے معنی میں بولا جاتا ہے گویا تبیین کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جسے باہر سے لا کر کسی بات کسی معاملے یا کسی کلام کے سپرد کر دیا جائے وہ کسی بات کی وہ کنہ ہے جو ابتداء ہی سے اس میں موجود ہوتی ہے۔ اور آپ اسے کھول دیتے ہیں وہ کسی کلام کا وہ مدعا ہے جو اس کلام کی ابتداء ہی کے وقت سے اس

کے ساتھ ہوتا ہے اور آپ اسے واضح کر دیتے ہیں وہ کسی چیز کا وہ لازم ہے جو شروع ہی سے اس کے وجود کی حقیقت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسے آپ منصۂ شہود پر لے آتے ہیں چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تبیین کسی کلام کے متکلم کے اس مدعا کا اظہار ہے جسے دوسروں تک پہنچانے کے لئے وہ اس کلام کو ابتداء وجود میں لایا تھا اس کے بعد امام بزدوی اور امام شاطبی کے دو حوالے دے کر معز امجد نے اس بحث کو سمیٹ دیا ہے۔''

یہ تمام دلائل لفظ بہ لفظ برہان میں جاوید غامدی کے نام سے موجود ہیں اور کم وبیش یہی الفاظ ڈاکٹر فاروق کی ''اسلام کیا ہے'' میں موجود ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا مکتب فکر ہی سرقے کی روایت پر کھڑا ہے۔ اصلاحی صاحب نے بلنچلی اور حمید الدین فراہی کے افکار کا سرقہ کیا۔ غامدی صاحب نے فراہی، امین احسن اصلاحی، مولانا مودودیؒ، ابوالجلال ندوی، ڈاکٹر فضل الرحمان، احمد دین امرتسری، اسلم جیراج پوری، علامہ مفتی محمد طاہر مکی، عمر احمد عثمانی، حبیب الرحمان کاندھلوی، حکیم محمد نیاز، حکیم محمود احمد عباسی [خلافت معاویہ ویزید]، حکیم احمد علی عباسی، مارٹن لنگز اور نسیم ظہیر اصلاحی کے مضامین کا سرقہ کیا ہے۔ ظہیر اصلاحی کا مضمون ''تحقیقات اسلامی'' علی گڑھ میں شائع ہوا، وہاں سے اشراق میں مئی ۱۹۹۱ء میں ''مولانا فراہی کا طریقہ تفسیر'' کے نام سے شائع ہوا۔ اسی سال ۱۹۹۱ء کے اگست کے اشراق میں غامدی صاحب کے مضمون اصول ومبادی میں ظہیر اصلاحی کے حوالوں کا غلط سلط سرقہ غامدی صاحب نے کرلیا۔ یہ سرقہ غامدی صاحب کی کتاب ''اصول ومبادی'' ۲۰۰۵ء میں بھی من وعن موجود ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ غامدی صاحب نے مستشرقین کی کتابوں کا مطالعہ نہیں فرمایا۔

غامدی کا سرقہ

نسیم ظہیر اصلاحی غازی کا مضمون ''مولانا فراہی کا طریقہ تفسیر'' اشراق کے شمارے مئی ۱۹۹۱ء کے صفحہ ۴۵ سے ۵۸ تک محیط ہے اس مضمون سے منحول وغیرہ منحول کلام کے بارے میں حوالے اور اقتباسات جاوید غامدی صاحب نے اپنے اصول ومبادی کے لیے سرقہ کیے اور اشراق کے شمارے اگست ۱۹۹۱ء کے صفحہ ۲۱ تا ۲۸ ''ام القریٰ کی زبان'' کے نام سے اصول ومبادی قسط ۲ کے ص ۲۵:۲۶ پر نسیم ظہیر کا حرف بہ حرف سرقہ فرمایا۔

غامدی صاحب ظہیر اصلاحی کی عبارت کا درست سرقہ بھی نہیں کر سکے۔ مارگولیتھ نے اصول

الشعر العربی کے نام سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ البتہ مارگولیتھ کے رد میں چارلیس جیمس لیال کی کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر یحیٰی جبوری نے ''اصول الشعر العربی'' کے نام سے کیا تھا۔ غامدی صاحب سرقہ کی عجلت میں غلط حوالہ درج کر گئے۔ اگر انھوں نے مستشرقین کی کتابیں براہ راست پڑھی ہوتیں تو وہ اصل کتاب کے حوالے دیتے لیکن غامدی صاحب نے نہ اصل کتابیں پڑھیں نہ ترجمہ شدہ کتابیں حتیٰ کہ سرقے کے وقت ظہیر اصلاحی کے چھوٹے سے نثر پارے بھی درست طریقے سے سرقہ نہ کر سکے۔ مارگولیتھ نے عربی میں اصول الشعر عربی کے نام سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ دونوں مستشرقین کی کتابیں جرمن اور انگریزی زبانوں میں دستیاب ہیں۔

جاوید غامدی صاحب نے امین احسن اصلاحی کی کتاب ''دعوت دین اور اس کا طریقہ کار'' سے کئی صفحات میزان میں سرقہ کر لیے لیکن کہیں حوالہ نہ دیا۔ دونوں عبارتوں کا موازانہ پڑھیے:

مسئلہ انتحال تو مستشرقین کی سازش ہے۔ دراصل اسلام کو رسوا کرنے کے سلسلے کی ایک کڑی ''مسئلہ انتحال'' ہے۔ مفضل ضبیؒ اور اصمعی کوفی نے کلام جاہلی میں غث وسمین میں امتیاز کی کسوٹیاں قائم کیں اور غیر منحول اشعار کے متعدد مجموعے مرتب کردیے اور مصنوع ومنحول کلام کو غیر مصنوع ومنحول کلام سے الگ کرلیا۔ [اشراق، ص۵۴۔۵۵، مئی ۱۹۹۱ء] مستشرقین اور موجودہ دور کے طٰہٰ حسین جیسے متجددین کی فتنہ سامانیوں نے کلام جاہلی کو بہت سے مسلمان علماء کی نظروں میں مشکوک بنا دیا ہے۔ حالانکہ خود بعض مستشرقین اور محققین علماء نے ان کی جملہ فتنہ سامانیوں کا قلع قمع کردیا ہے۔ تفصیل کے لیے ناصر الدین الاسد کی ''مصادر الشعر الجاہلی''، ڈاکٹر شوقی ضیف کی العصر الجاہلی، ڈاکٹر یحییٰ جبوری کی ''الشعر الجاہلی'' اور انہی کے قلم سے مستشرق عالم چارلس جیمس لیال کے مضمون کا عربی ترجمہ ''اصول الشعر العربی] جو انتحال سے متعلق مارگولیتھ کے مضامین کے رد میں ہے کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ [اشراق، ص۵۵۔۶۵، مئی ۱۹۹۱ء]

غامدی صاحب نے ڈاکٹر یحییٰؒ کے قلم سے لیال کے نقد کے عربی ترجمے ''اصول الشعر العربی کو ایس مارگولیت کا مضمون قرار دیا بے چارے سرقے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ ساحل

کلام عرب میں اگرچہ کچھ منحول کلام بھی شامل ہے لیکن جس طرح نقد حدیث کے علماء اس کی صحیح اور سقیم رواتیوں میں امتیاز کرسکتے ہیں اسی طرح کلام کے نقاد بھی روایت و درایت کے واضح معیارات کی بناء پر اس کے خالص اور منحول کو ایک دوسرے سے الگ کردے سکتے ہیں۔ [اس عبارت کے حاشیے میں درج ہے کہ ''اس زمانے میں مشہور مستشرق ڈی۔ ایس مارگولیت نے اپنے مضمون: ''اصول الشعر العربی'' سے کلام جاہلیت کے پورے ذخیرے کو ناقابل اعتماد قرار دینے کی جس مہم کا آغاز کیا تھا اور جو ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی ''فی الادب الجاہلی'' میں اپنی انتہا تک پہنچی، اس سے افسوس ہے کہ بعض دوسرے مسلمان علما بھی متاثر ہوئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود مستشرقین ہی میں سے چارلس جیمس لیال اور بروکلمان جیسے اہل علم نے اس نقطۂ نظر کی تردید اس مدلل طریقے سے کردی ہے کہ اب کم سے کم علم کی دنیا میں اس کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی''۔ اس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر شوقی ضیف کی ''العصر الجاہلی''، ناصر الدین الاسد کی ''مصادر الشعر الجاہلی'' اور ڈاکٹر یحییٰ جبوری کی الشعر الجاہلی [۲۰۰۵ء میں اصول و مبادی کی کتابی شکل میں اشاعت کے موقع پر ڈاکٹر شوقی، ناصر اسد اور یحییٰ جبوری کے حوالے غامدی صاحب نے حذف فرما دیے۔]

[جاوید غامدی ص ۱۵۔۱۶، اصول و مبادی ۲۰۰۵، اشراق اگست ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۔۲۶]

امین احسن اصلاحی کی عبارت	غامدی صاحب کی عبارت ''میزان'' میں
دعوتِ حق کے مخالفین ہر دعوتِ حق کو عموماً تین طرح کے مخالفین سے سابقہ پڑتا ہے: ۱۔ معاندین ۲۔ متربصین ۳۔ مغفلین	قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین میں بالعموم تین ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں: مخالفین میں معاندین، متربصین اور مغفلین اور موافقین میں سابقینِ اولین، متبعین بالاحسان اور ضعفا و منافقین۔
معاندین: [۱] معاندین سے مراد وہ گروہ ہے جو دعوت کے اثر کا اندازہ کرتے ہی اس کی مخالفت کے لئے خم ٹھونک کر، میدان میں اتر آتا ہے۔ ان کی مخالفت کی تہ میں یوں تو مختلف قسم کے محرکات کام کرتے ہیں، لیکن تین محرک اصلی اور بنیادی ہیں۔ ایک حمیّتِ جاہلیت، دوسرا استکبار اور حسد، اور تیسرا مفاد پرستی۔ یہ تینوں حق کی مخالفت میں پیش قدمی کے اعتبار سے تو بالکل یکساں نوعیت کے ہیں، لیکن اپنی روح کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔	''معاندین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو دعوت کے موثر ہوتے ہی بالکل کھلم کھلا اور پوری شدت کے ساتھ اس کے مقابلے میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کی اس مخالفت کا محرک حمیتِ جاہلی بھی ہوتی ہے، حسد و تکبر بھی اور مفاد پرستی بھی۔ یہ تینوں محرکات مخالفت کی نوعیت کے لحاظ سے یکساں، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے بالکل الگ الگ ہیں۔

حمیت جاہلیت کی بیماری درحقیقت نظامِ جاہلی کے ساتھ اخلاص و وفاداری کا نتیجہ ہے۔ اس بیماری میں بالعموم وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو اپنے عہد کے نظامِ جاہلی کے مخلص اور وفادار خادم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی دعوت ایسی اٹھ رہی ہے جو اس نظام کو جس کے وہ علمبردار ہیں توڑ پھوڑ کر اس کی جگہ کوئی نیا نظام برپا کرنا چاہتی ہے تو ان کے اندر ایک ہیجان برپا ہوجاتا ہے۔ اور وہ پورے جوش کے ساتھ اس مخالفت میں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔لیکن چونکہ ان کی یہ مخالفت بیشتر قومی اخلاص پر مبنی ہوتی ہے جس میں جوش تو ہوتا ہے، لیکن یہ جوش شرافت سے عاری

پہلا محرک بالعموم ان لوگوں کو مقابلے پر لاتا ہے جو اپنے زمانے کی جاہلیت کے ساتھ پوری طرح مخلص اور اس کے نظام کے سچے خادم ہوتے ہیں۔ وہ پیغمبر کی دعوت کو اپنے نظام اور اس کے پس منظر میں موجود اپنے آبا کی روایات کے لیے ایک چیلنج سمجھ کر اس کے مقابلے میں آتے ہیں۔ ان کی یہ مخالفت چونکہ قومی حمیت پر مبنی ہوتی ہے، اس وجہ سے اس میں رذالت اور کمینگی نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ اگر مخالف

نہیں ہوتا۔اس طرح کی مخالفت میں اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ غلط فہمیاں رفع ہونے کے بعد یہ عداوت محبت سے بدل جائے اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ محبت بھی ویسی ہی پرجوش اور طاقت ور ہوتی ہے جیسی پرجوش اور طاقتور عداوت ہوتی ہے۔اسلامی دعوت کی تاریخ میں اس کی بہترین مثال ابوجہل اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت ہے۔ جیسے حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما بعض جاہلیت کے غلاف سے نکلنے میں

رہتے ہیں تو ابوجہل کی طرح قوم پرستی کے پورے ولولے کے ساتھ مخالف رہتے اور اگر ایمان لاتے ہیں تو حضرتِ عمر اور حضرتِ حمزہ کی طرح پورے دل اور پوری جان سے ایمان لاتے ہیں۔

بڑی دیر لگاتے ہیں، جیسے ابوسفیانؓ لیکن ایک وصف ان سب میں مشترک ہوتا ہے وہ یہ کہ جب یہ جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام اختیار کرتے ہیں تو آتے ہی اسلام کی صفِ اول میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں جس طرح کل تک وہ جاہلیت کی صفِ اول میں تھے: **خیار هم فی الجاهلیة خیار هم فی الاسلام** (ان میں سے جو دورِ جاہلیت میں بہترین تھے وہ اسلام کے زمانہ میں بھی بہترین ہیں)۔

[۲] استکبار اور حسد کی وجہ سے دعوتِ حق کی مخالفت بالعموم وہ لوگ کرتے ہیں جو روایتی دینداری یا موروثی مالداری کی وجہ سے نظامِ جاہلی کے اندر پیشوائی اور سرداری کے مقام پر متمکن ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آگے چلتے رہنے کی وجہ سے آگے چلنے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ حق کے پیچھے چلنے میں بھی انہیں عار محسوس ہوتا ہے اور دوسرا محرک عموماً ان لوگوں کو معاندت پر ابھارتا ہے جو وقت کے نظام میں نسلاً بعد نسلٍ دینی یا دنیوی ریاست کے مالک چلے آرہے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ سرداری اور پیشوائی کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر کسی پیغمبر کو بھی اپنا سردار اور پیشوا ماننا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا اور وہ حق کو بھی لازماً اپنا پیرو بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ظاہر ہونا چاہیے ہمارے ہی واسطہ سے ظاہر ہونا ہوگا۔ اس غرور کے ساتھ ظاہر کہ کسی ایسے حق کو قبول کرنا ان لوگوں کے لیے تقریباً ناممکن ہے جس کے داعی وہ خود نہ ہوں۔ چنانچہ دعوتِ حق کی پوری تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ جو لوگ اس مرض میں متبلا رہتے ہیں ان کو حق پر ایمان لانے کی بہت کم ہی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ مکہ اور طائف کے وہ سردار جو کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر کوئی نبی بھیجنا ہی ہوتا تو وہ ہمارے اندر سے کسی کو بھیجتا۔ اس طرح کے مخالفین ایک داعیٔ حق کے لئے اپنے اندر امید سے زیادہ مایوسی کا پہلو رکھتے ہیں۔ ان میں بہت تھوڑے نکلتے ہیں جن کو قبولِ حق کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ یہ اپنے استکبار کیوجہ سے اپنے آپ کو الوہیت کے منصب پر سرفراز کر لیتے ہیں اور اس منصب کو چھوڑنا اس وقت تک گوارا نہیں کرتے جب تک اس کو چھوڑنے پر مجبور نہ کر دیے جائیں۔ قرآن مجید میں استکبار کو قبولِ حق کے سب سے بڑے موانع میں سے شمار کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے جگہ جگہ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کے پیچھے زیادہ وقت ضائع کرنے سے روکا گیا ہے جو دنیوی مال و متاع کی فراوانی یا مذہبی و دینوی ریاست کی وجہ سے اپنے غرور میں سرمست ہیں۔
حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے وقت کے فقیہوں اور فریسیوں

ہیں، لیکن جب دیکھتے ہیں کہ اس کا اثر لوگوں میں بڑھ رہا ہے تو حسد کی آگ میں جل اٹھتے اور وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو حاسدین اس دنیا میں اپنے مخالفین کے خلاف کرتے رہے ہیں۔

کے غرور ہی کی بنا پر فرمایا تھا کہ ''مبارک ہیں وہ جو
دل کے غریب ہیں کیوں کہ آسمان کی بادشاہی ان
ہی کی ہے''۔ نیز فرمایا تھا کہ ''اونٹ کا سوئی کے
ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ
دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو''۔ بعد کے
واقعات نے اس پیشن گوئی کی پوری پوری تصدیق
کردی۔ انجیل اور قرآن مجید دونوں سے یہ بات
واضح ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت
پر یروشلم کے علماء اور فقہا میں سے ایک شخص بھی
ایمان نہیں لایا۔

یہاں تک کہ ان سے مایوس ہو کر حضرت کو دریا کے
کنارے کے ماہی گیروں کے سامنے اپنی دعوت
پیش کرنی پڑی۔ اور انہی کے اندر سے اللہ کے کچھ
بندے ان کو ایسے ملے جنہوں نے دعوت حق کے
اس کام کو سنبھالا۔ کم و بیش یہی صورتِ حال اس
وقت پیش آئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
دعوت بلند ہوئی۔ اہل کتاب کے پیشوایان دینی
میں سے صرف گنتی کے چند نفوس اسلام لائے۔
اس گروہ کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ
شروع شروع میں یہ اپنے

استکبار کی وجہ سے دعوت کو حقارت کی نظر سے دیکھتا
ہے اور اس کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتا، لیکن جب
دعوت بڑھنے اور پھیلنے لگتی ہے اور ان کو اپنے پاؤں
کے نیچے کی زمین کھسکتی نظر آتی ہے تو ان پر حسد کا
سخت دورہ پڑتا ہے۔ اس وقت وہ داعی اور دعوت
کی مخالفت میں وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو ایک
مبتلائے حسد گروہ کر سکتا ہے۔

[۳] مفاد پرستی کی وجہ سے دعوتِ حق کی مخالفت وہ لوگ کرتے ہیں جن کا اخلاقی تصور حب ذات سے آگے نہیں بڑھتا۔ ان کا سارا اخلاقی واجتماعی فلسفہ اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے اور پھر برابر اسی محور پر گھومتا رہتا ہے۔ یہ محض انسان کی اس فطری مجبوری کی وجہ سے کہ وہ ایک اجتماعی وجود ہے، جو تنہا زندگی بسر نہیں کرسکتا، کسی اجتماعی نظام کے اندر شامل تو ہوتے ہیں، لیکن اس کے اندر ہر قدم پر صرف استحقاق تلاش کرتے ہیں، کسی جگہ بھی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ان کے نزدیک حق اور باطل کا معیار ان کی اپنی ذات ہے۔ جس چیز سے ان کی ذات کا بھلا ہو وہ حق ہے اور جس چیز سے ان کے کسی ذاتی مفاد کو ٹھیس لگ رہی ہو وہ باطل ہے۔ جن لوگوں کا اخلاقی اور اجتماعی تصور اتنا پست ہ وہ لازماً ہر اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں جس سے ان کی مفاد پرستی کا گھنونا پن دوسروں کے

تیسرا محرک عام طور پر ان لوگوں کو آمادۂ مخالفت کرتا ہے جو اپنے ذاتی مفادات سے آگے کسی چیز کو دیکھنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ ہر معاملے میں اپنی ذات کے اسیر، ہر قدم پر استحقاق کے طالب اور ہر شے کے حق و باطل کا فیصلہ اپنی ذات کے حوالے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اپنی اس اخلاقی پستی اور دنائت کی وجہ سے وہ بس اپنے مفادات ہی کی طرف لپک سکتے ہیں، پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنا اور اس کے عقبات سے گزرنا ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں ابولہب کا وجود اسی کی مثال ہے۔

یا خود ان کے سامنے واضح ہو رہا ہو۔ اس طرح کے لوگ ان تمام جوہری صفات سے بالکل عاری ہوتے ہیں جن سے ایک اعلیٰ سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔

اسلامی دعوت کی تاریخ میں اس کی نہایت حقیقت افروز مثال ابولہب کا وجود ہے جس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے سارا اختلاف محض اس وجہ سے تھا کہ آپ کی دعوت سے اس کی سیرت کے تمام بدنما پہلو لوگوں کے سامنے آ رہے تھے اور اپنی

خود غرضی اور زر پرستی سے اس نے جو دولت اکٹھی کر رکھی تھی وہ سب معرضِ خطر میں تھی۔ یوں تو وہ قریش کے قائم کردہ نظام جاہلی میں سب سے اونچے عہدہ پر فائز تھا، لیکن اس نظام کے ساتھ اس کی ساری وابستگی محض اس وجہ سے تھی کہ منصب رفادہ اور خانہ کعبہ کی کلید برداری کی وجہ سے اس کو مالی دستبرد کے بہت سے مواقع حاصل تھے۔ اس سے آگے نہ تو اس کو اپنی قوم ہی سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ اس نظام کے خیر و شر ہی سے کوئی دلچسپی تھی جس کا وہ سب سے بڑا لیڈر تھا۔ اس کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ یوں تو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں آگے رہتا اور لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتا کہ یہ آباء و اجداد کے قائم کردہ نظام کو برباد کرنے والی دعوت ہے، لیکن بدر کے موقع پر جو قریش کے نقطۂ نظر سے ایک فیصلہ کن معرکہ تھا اور جس میں ان کے تمام سردار پورے جوش دینی کے ساتھ شریک ہوئے، وراثتِ ابراہیمی کا یہ سب سے بڑا دعوے دار گھر میں بیٹھا رہا اور کرایہ کے ایک آدمی کو اپنی طرف سے میدان میں لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ اس طرح کے لوگوں کا ہر دعوت حق کے ساتھ فطری تعلق صرف مخالفت ہی ہو سکتا ہے اور مخالفت ہی کا ہوتا ہے۔

متربصّین: متربصین سے مراد وہ گروہ ہے جو دعوتِ حق کا حق ہونا تو کسی حد تک محسوس کر لیتا ہے، لیکن نہ تو اس کے اندر اتنی اخلاقی قوت ہی ہوتی کہ وہ حق کو مجّرد اس بنا پر کہ وہ حق ہے قبول کر کے اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا سکے اور نہ عقلی اعتبار ہی سے یہ لوگ اتنے بلند ہوتے ہیں کہ نظامِ حق کے عملاً برپا ہونے سے پہلے کامیابی کے ان امکانات کا اندازہ کر سکیں جو حق کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ اس کمزوری کی وجہ سے یہ گروہ بجائے اس کے کہ کسی حق کے حق ہونے کا فیصلہ اپنی عقل سے کرے، اس معاملہ کو مستقبل کے حوالہ کر کے انتظار کرتا ہے کہ اگر

''متربصین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جن پر پیغمبر کی دعوت کا حق ہونا تو کسی حد تک واضح ہوتا ہے، لیکن وہ حق کو مجرد حق کی بنیاد پر ماننے کے بجائے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ دیکھیں مستقبل اس دعوت کے بارے میں کیا فیصلہ سناتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر کے مقابلے میں یہ زیادہ سرگرمی تو نہیں دکھاتے، لیکن ساتھ ہمیشہ مخالفین ہی کا دیتے ہیں اور شب و روز اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ حق و باطل میں سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، اور ان کو اس معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ آزمائش اور کشمکش کے زمانے میں

مستقبل نے اس کی کامیابی کا فیصلہ کر دیا تو اس کا ساتھ دیں گے ورنہ زندگی جس نہج پر گزر رہی ہے گزرتی جاتی ہے یہ لوگ اپنی اخلاقی کمزوری اور عقلی ضعف کی وجہ سے ایک ذہنی کشمکش اور تردد و تذبذب کی حالت میں مبتلا ہوتے ہیں اس وجہ سے دعوتِ حق کی مخالفت میں یہ بہت سرگرم تو نہیں ہوتے لیکن وقت کے نظامِ غالب کے اثر سے ساتھ مخالفینِ دعوت ہی کا دیتے ہیں اور حق و باطل کی کشمکش کے ہر مرحلہ میں زیادہ تر ان کی کوشش اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ کوئی صورت سمجھوتے کی پیدا ہو جائے کہ حق و باطل دونوں ساتھ ساتھ مل کر چل سکیں۔ یہ لوگ ایک بڑی حد تک منکرین حق کے گروہ میں وہی پوزیشن رکھتے ہیں جو موافقین حق کے گروہ میں منافقین کا ہوا کرتا ہے۔ اور اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے حق کی بڑی سے بڑی کامیابی

یہ پیغمبر کے حق میں کوئی کلمۂ خیر بھی کہہ سکتے ہیں، اس کے بارے میں کبھی اپنی پسندیدگی بھی ظاہر کر سکتے ہیں، اپنے دل میں اس کی کامیابی کے متمنی بھی ہو سکتے ہیں اور کبھی اس کی مالی یا اخلاقی مدد کا حوصلہ بھی کر سکتے ہیں، لیکن اس زمانے میں اسے ماننا اور اس کے لیے جوکھم برداشت کر لینے پر آمادہ ہو جانا، ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔

میں ایمان نہیں لا سکتے جس دور میں وہ کشمکشوں
اور آزمائشوں سے گزر رہی ہو، یہ ممکن ہے کہ یہ
اس کے حق میں چوری چھپے کوئی کلمہ خیر کہہ دیں۔ یہ
بھی ممکن ہے کہ ان کے دل کے مخفی گوشوں میں اس
کی کامیابی کی کوئی خواہش پیدا ہو جائے۔ یہ بھی
متوقع ہے کہ وہ ان لوگوں کو کچھ اچھا نہ سمجھیں جو
دعوت کی مخالفت میں پیش پیش ہوں، بلکہ ایسا بھی
ممکن ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے لوگ کبھی کبھی
دعوتِ حق کی مالی یا اخلاقی مدد کا حوصلہ کرلیں۔ یہ
ساری باتیں ممکن ہیں، لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ
یہ لوگ اس بات کی ہمت کرلیں کہ ٹوٹے ہوئے
تختوں کو جمع کریں، ان کو جوڑ کر کشتی بنائیں، اس
کشتی کو منجدھار میں ڈال دیں اور بادِ مخالف سے لڑ
کر اس کو ساحلِ مراد پر پہنچانے کی کوشش کریں۔
ان کی ذہنی حالت دعوت کے مختلف ساز گار اور
ناساز گار حالات کے لحاظ سے متغیر ہوتی رہتی
ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ معاندین کے سے جوش
کے ساتھ اس کی مخالفت اور بیخ کنی پر آمادہ ہو
جائیں یا کھلم کھلا اس پر ایمان لا کر اس کی حمایت و
نصرت کے لئے سر بکف ہو جائیں۔ یہ اس کی
تباہی بھی چاہتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ اس کو تباہ
کرنے کے لیے خود انہیں کوئی خطرہ مول لینا
پڑے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ کشتی کسی چٹان سے
ٹکرا کر خود بخود پاش پاش ہو جائے۔ اسی طرح اگر
اس کی کامیابی کی آرزو

کرتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ اس راہ میں انہیں
کوئی جوکھم برداشت کرنا پڑے، بلکہ یہ چاہتے
ہیں کہ دوسرے اس کے لئے جان و مال کی
قربانیاں کر کے اس کو پروان چڑھائیں اور یہ اس
کا پھل کھائیں۔

سیاسی پیشواؤں کے مقلد اور مرید ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک موروثی حسن ظن رکھتے ہیں اس وجہ سے کوئی ایسی بات جو ان کے ائمہ سیاست و مذہب کے مسلک کے خلاف ہو ان کے دل کو اولاً تو لگتی ہی نہیں اور اگر لگتی بھی ہے تو شروع شروع میں وہ اس سے بے گانگی سی محسوس کرتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ان کے ائمہ قدم اٹھائیں تو یہ ان کے ساتھ چلیں۔ ان کے ائمہ ان اسباب کی وجہ سے جو اوپر بیان ہوئے، موافقت کے بجائے مخالفت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ساتھ اپنے پیروؤں کو بھی لے چلیں۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ یہ گروہ دعوت سے واقف ہونا شروع ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ حق و باطل کی کشمکش جتنی ہی بڑھتی جاتی ہے عامۃ الناس اتنے ہی اس سے قریب ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اس کشمکش میں ان کو داعی کے بے لوث کیریکٹر اور اس کی دعوت کی دل پذیری کا بطور خود اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر کچھ ذہین اور اخلاقی جرات رکھنے والے اشخاص دعوت کے حامی بن جاتے ہیں وقت کے اربابِ کار جب دیکھتے ہیں کہ ان کے پیروان کے ہاتھ سے نکل چلے ہیں تو وہ دعوت اور داعی کی مخالفت میں پوری قوت کے ساتھ میدان میں اتر آتے ہیں اور عوام کو اپنے ساتھ لگائے رکھنے کے لیے پراپیگنڈے کے سارے حربے استعمال کرنا ہوتے ہیں چنانچہ ان کے اندر یہ تبدیلی ان میں سے بعض جرأت مند اور اونچی سیرت کے لوگوں کو اقدام پر آمادہ کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں یکے بعد دیگرے یہ پیغمبر سے وابستہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔

شروع کر دیتے ہیں یہ چیز اگرچہ بہتوں کو دعوت
کے خلاف بدگمانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے، لیکن اس
دور میں ان لوگوں کو داعی کے اعلیٰ کیریکٹر اور اس کی
دعوت کی عقلی قوت کا اپنے لیڈروں کے اخلاق اور
ان کی دعوت کی قوت سے موازنہ کرنے کا اچھا
موقع ملتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ
آہستہ عوام اپنے سابق لیڈروں سے بدگمان اور نئی
دعوت سے متاثر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اگرچہ
دیرینہ تقلید کی بندشیں فوراً دور نہیں ہوتیں، لیکن اس
گروہ کے جری اور بلند سیرت اشخاص آگے بڑھ
کر حق پرستی کی راہ کھول دیتے ہیں اور یکے بعد دیگر
اس طبقہ کا ایک بڑا حصہ حق کے آغوش میں آ جاتا
ہے۔

سابقین اولین: دعوتِ حق کے موافقین میں سب سے اونچا درجہ سابقین اولین کا ہے۔ سابقین اولین سے مراد وہ گروہ ہے جو کسی دعوتِ حق کے بلند ہوتے ہی اس کو لبیک کہتا ہے اور بے جھجک اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ یہ ان سلیم الفطرت لوگوں کی جماعت ہوتی ہے جو دعوت سے پہلے بھی اپنے اندر وہی کچھ محسوس کرتے ہوتے ہیں جس کی دعوت ایک داعی حق دیتا ہے۔ یہ عقلی اعتبار سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ صرف دنیا کے ظاہر پر قناعت نہیں کرتے، بلکہ اس کے باطن کے اشارات کو بھی دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور ان کی نگاہ میں حقیقی قدر ان باطنی حقائق ہی کی ہوتی ہے نہ کہ ظواہر کی۔ یہ حیوانوں کی طرح مجرد خواہشوں کے بندے نہیں ہوتے، بلکہ عقل اور فطرت کے تقاضوں کو جانتے ہیں اور زندگی کے تمام مرحلوں میں انھی کو مقدم رکھتے ہیں۔ یہ کسی بات کو حق ماننے کے لیے عقل وفطرت کی تصدیق کافی سمجھتے ہیں، اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ کون اس کا مخالف ہے اور کون اس کے موافق ہے۔ یہ نہ ماضی کے مرید ہوتے، نہ حاضر کے بندے، نہ اللہ کے رسولوں کے سوا کسی بڑے سے بڑے مقتدا اور پیشوا کو یہ درجہ دیتے کہ وہ بجائے خود ایک حجت اور سند بن جائے۔

''سابقینِ اولین'' کی اصطلاح قرآنِ مجید میں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوئی ہے کہ جو کسی دعوتِ حق کو سنتے ہی اس کی طرف لپکتے ہیں اور ہر نتیجے سے بے پروا ہو کر اپنا سب کچھ اس کے لیے قربان کر دینے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جن کی فطرت صالح، عقل بیدار، دل زندہ، آنکھیں بینا، کان شنوا اور دماغ ہر صحیح بات کو سمجھنے اور قبول کر لینے کے لیے پوری طرح تیار ہوتا ہے۔ یہ چیزوں کو عقل وفطرت کی روشنی میں دیکھتے اور جب ان کی صحت پر مطمئن ہوجاتے ہیں تو ہر طرح کے جذبات وتعصّبات سے بلند اور تمام خطرات سے بے خوف ہو کر برملا ان کا اعتراف واقرار کر لیتے ہیں۔ یہ سیرت وکردار کے لحاظ سے اپنی قوم میں گلِ سرسبد اور اپنی سرزمین پر ہمالہ والوند کی طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ دعوتِ حق ان کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں ہوتی، بلکہ ان کے دل کی آواز، ان کے ضمیر کی صدا اور ان کی روح کا نغمہ ہوتی ہے، اور یہ بس منتظر ہی ہوتے ہیں کہ کوئی اٹھے اور یہ اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنے سارے دل اور ساری جان کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہوجائیں۔ چنانچہ پیغمبر جب اپنی دعوت کی صدا بلند کرتا ہے تو یہ نہ عذر تراشتے ہیں، نہ اس کا حسب و

اسی طرح یہ لوگ اخلاقی اور عملی اعتبار سے بھی بہت بلند ہوتے ہیں۔ ان کی عقل جس چیز کا حق ہونا ان پر واضح کر دیتی ہے ان کی اخلاقی جرأت ان کو آمادہ کرتی ہے کہ اس حق کو قبول کریں اور اس کے لیے ہر خطرہ کو گوارا کریں۔ حق کی حمایت کے لیے یہ لوگ نہایت ذکی الحس ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ حق کو مظلومیت کی حالت میں دیکھیں اور اس کے لیے ان کا دل دردمند نہ ہو۔ یہ اپنے زمانہ کے ہر نسب دیکھتے ہیں، نہ ماضی و حال کا تجزیہ کرتے ہیں، نہ شخصیت کے بخیے ادھیڑتے ہیں، نہ معجزے طلب کرتے ہیں، نہ حجتیں کھڑی کرتے ہیں اور نہ لاطائل بحثیں کرتے ہیں، بلکہ فوراً یہ کہتے ہوئے کہ: میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور اس عزم کے ساتھ اس کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اب ہرگز پیچھے نہ ہٹیں گے:

اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے خود لپکتے ہیں جس میں ان کو اجتماعی فلاح میں دیکھیں اور اس کے لیے ان کا دل دردمند نہ ہو۔ یہ اپنے زمانہ کے ہر اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے خود لپکتے ہیں جس میں ان کو اجتماعی فلاح کا کوئی پہلو نظر آئے۔ ان کی غیرت اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ حق کی خدمت کا کوئی کام ہو رہا ہو، دوسرے اس کے لیے زحمتیں اور مصیبتیں جھیل رہے ہوں، جان و مال کی قربانیاں پیش کر رہے ہوں اور وہ محض ایک خاموش تماشائی کی طرح اس کو دیکھ کر گزر جائیں، یا محض دور سے دو حرف تحسین و آفرین کے کہہ کر اس پر قانع ہو جائیں بلکہ یہ اس کو برپا کرنے کے یے خود اٹھتے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے لیے خود سبقت کرتے ہیں۔ یہ برے سے برے ماحول کے اندر اچھی اور با اخلاق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے اپنے زمانہ کی جاہلیت سے برابر کش مکش کرتے رہتے ہیں۔ جہاں سب کے ہاتھ ظلم اور ناانصافی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں، وہاں یہ عدل و انصاف کے کام کرتے ہیں۔

ولو قطعوا راسی لدیک واوصالی

چونکہ یہ لوگ اس حق کے لیے منتظر اور
چشم براہ تھے اس وجہ سے اس کو پا کر انھوں نے
بحثیں اور حجتیں نہیں کھڑی کیں، بلکہ اس کو دیکھ کر
ان کے دلوں کا وہی حال ہوا جو اپنے کسی گم گشتہ
عزیز کو مدتوں کے بعد پا کر کسی شخص کا ہوتا ہے۔
اس طرح کے صاف ذہن رکھنے والے لوگ، جو
پہلے سے اعلائے کلمۂ حق کا داعیہ رکھتے ہیں، وہ
وقت کی اس دعوت میں اپنے درد کی دوا اور اپنی
خلش کی شفا پاتے ہیں اس وجہ سے فوراً اس کو قبول
کر لیتے ہیں اور اس کو کامیاب بنانے کی جدوجہد
میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ یہ معجزے اور کرشمے نہیں
طلب کرتے، نام و نسب اور شجرہ نہیں دریافت
کرتے، لا طائل بحثیں اور حجتیں نہیں کھڑی کرتے
صرف یہ دیکھتے ہیں کہ داعی جس بات کے لیے
پکار رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں اور اسی راہ پر وہ خود بھی
گامزن ہے یا نہیں؟ اگر اس پہلو سے ان کا
اطمینان ہو گیا تو وہ پوری دلجمعی کے ساتھ اس کے
ساتھ ہو لیتے ہیں۔ آئندہ کے موہوم خطرات کی بنا
پر آج کی ایک واضح حقیقت کو نہیں جھٹلاتے۔

متبعین باحسان: دعوتِ حق کے قبول کرنے والوں کا دوسرا طبقہ متبعین باحسان کا طبقہ ہے۔ اس سے مراد وہ گروہ ہے جو سابقین اولین کو دیکھ کر حق کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ لوگ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے سابقین اولین کے درجہ کے نہیں ہوتے اس وجہ سے اپنی ذاتی تحریک[Initiative]

''متبعین بالاحسان'' وہ لوگ ہیں جو سابقینِ اولین کے اقدام کے بعد ان کو دیکھ کر حق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے پہلی صف کے لوگ تو نہیں ہوتے، لیکن صفِ دوم میں یقیناً سب سے بہتر ہوتے ہیں۔ سابقینِ اولین کی طرح یہ بطورِ خود اگر آگے نہیں

سے کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے اور کسی نئی راہ میں چلنے کے لیے پہل کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر قیادت کی صلاحیت نہیں ہوتی اس وجہ سے دعوتِ حق کی عقلی اور استدلالی قوت ان کو اتنا نہیں متاثر کرتی جتنا اس کو قبول کرنے والے پیشروؤں کی ہمت و جرأت ان کو متاثر کرتی ہے۔ یہ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی دعوتِ حق اٹھی ہے، اس کو کچھ لوگوں نے ہمت کر کے قبول کرلیا ہے، اس کو وہ لے کر آگے بڑھ رہے ہیں اور اس کو دنیا میں برپا کرنے کے لیے وہ ہر قسم کے خطرات جھیل رہے ہیں اور آئندہ جھیلنے کو تیار ہیں تو یہ منظر ان کے دلوں کو متاثر کرتا ہے اور وہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنی ہمت و قوت کو آزمانے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کی استعدادیں مختلف درجہ کی اور ان کی رکاوٹیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں اس وجہ سے اس کشمکش میں کچھ عرصہ لگ جاتا ہے۔ لیکن داعیانِ حق کی لگاتار جدوجہد اور پیش آنے والی مشکلات میں ان کا صبر و استقلال دیکھتے دیکھتے بالآخر ان کے دلوں کا زنگ بھی صاف ہوجاتا ہے اور وہ ہمت کر کے یکے بعد دیگرے باطل سے ٹوٹ ٹوٹ کر حق کی صفوں میں آملتے ہیں۔

بڑھتے تو اپنے پیش رووں کی جرأت و عزیمت، حق کے لیے ان کی سبقت اور اس راہ کے عقبات میں ان کی استقامت کو دیکھ کر پیچھے رہنا بھی ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ دعوتِ حق کی عقلی اور استدلالی قوت، بے شک انھیں اتنا متاثر نہیں کرتی، لیکن اہلِ ہمت کا شوق اور ان کی عزیمت جلد یا بدیر انھیں لازماً تسخیر کر لیتی ہے۔ تاہم پیغمبر کو ان کے معاملے میں کچھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ حق کے متعلق جو شبہات خود ان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور جو دوسروں کے پیدا کرنے سے پیدا ہوسکتے ہیں، وہ سب اگر دور کر دیے جائیں اور عزم و ہمت کی کچھ مثالیں ان کے سامنے آجائیں تو ان کی فطرت کا زنگ اتر جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر اللہ توفیق دے تو یہ پیغمبر کے ساتھی بن جاتے ہیں اور ہر آزمائش میں پورے خلوص اور حوصلے کے ساتھ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

سابقین اولین کی دیکھا دیکھی دیتے ہیں لیکن جب
ساتھ دیتے ہیں تو پورا ساتھ دیتے ہیں، کسی قسم کی
کمزوری، ہچکچاہٹ، بزدلی، تھڑدولے پن اور
نفاق کا اظہار نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ
عقلی اور اخلاقی اعتبار سے صفِ اول کے نہ سہی،
لیکن صفِ دوم کے بہترین آدمی ہوتے ہیں۔ یہ
اپنی خودی کے ضعف کی وجہ سے اپنے عہد کی
جاہلیت سے متاثر اور مرعوب ضرور ہو جاتے ہیں
لیکن ان کے اندر حق کا شعور مردہ نہیں ہو چکا ہوتا
ہے اس وجہ سے نظامِ باطل کی گاڑی جب تک
کھینچتے ہیں انقباض و تکدر کے ساتھ کھینچتے ہیں اور
اپنے دل کی گہرائیوں میں حق کی حمیت محسوس
کرتے رہتے ہیں۔ نظامِ باطل سے ان کا یہ
انقباض کبھی دب جاتا ہے، کبھی ابھرتا آتا ہے، لیکن
کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ یک قلم معدوم ہو جائے۔
بلاشبہ اپنے ماحول سے لڑ کر اس کو بدلنے کی ہمت
ان کے اندر نہیں ہوتی اس وجہ سے ان کو اپنے عہد
کے نظامِ باطل پر قانع رہنا پڑتا ہے، لیکن ان کی
اس قناعت کی تہہ میں ایک خلش دبی ہوئی ہوتی
ہے جو اس وقت لازماً ابھر آتی ہے جب ان کے
سامنے کوئی دعوتِ حق آتی ہے۔ یہ خلش جب
بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ ان کی
برداشت سے باہر ہو جاتی ہے تو ہمت کر کے اسی
راہ پر وہ خود بھی چل کھڑے ہوتے ہیں جس راہ پر
وہ دوسرے کچھ

حق پرستوں کو گامزن دیکھتے ہیں۔ چونکہ ان کا یہ آنا
اپنے ارادہ سے ہوتا ہے، نہ کہ کسی کے دباؤ سے،
اور چونکہ ان کا یہ اقدام ان کی حمیت کے تقاضے
سے وجود میں آتا ہے، نہ کہ کسی پوشیدہ خودغرضی کی
تحریک ہے، اس وجہ سے عزم و بصیرت کا وہ زادِ راہ
ان کے پاس موجود ہوتا ہے جو آئندہ مراحل و
مشکلات میں ان کے ایمان کی حفاظت کرتا ہے اور
کسی بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی ان کے
پاؤں لڑکھڑانے نہیں دیتا۔

ان لوگوں کو حق کی طرف کھینچنے کے لیے
داعی حق کو محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ لوگ، جیسا کہ
ہم اوپر ظاہر کر چکے ہیں، نہ عقلی اعتبار ہی سے اتنے
بلند ہوتے ہیں کہ حق کا پورا تصور تصور بغیر عملی
مثالوں کے ان کی گرفت میں آ جائے اور نہ اخلاقی
اعتبار ہی سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ اس کی
حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اگرچہ ان کے
سایہ کے سوا کوئی بھی ان کے داہنے بائیں نہ ہو۔
ان کی دونوں کمزوریوں کی وجہ سے لازماً داعی کو ان
کے ساتھ کچھ دنوں تک کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ سب
سے پہلے تو یہ اس بات کے محتاج ہوتے ہیں کہ حق
ان کے سامنے ایسی وضاحت کے ساتھ کھول دیا
جائے کہ اس کا کوئی پہلو گنجلک اور مبہم نہ رہ جائے۔
جو شبہات خود ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں
ان کو بھی دور کر دیا جائے اور جو شکوک دوسروں کے
پیدا کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں، حتی الامکان ان کو
بھی دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

ضعفاء اور منافقین: ضعفاء اور منافقین کو ہم نے
محض ظاہری مشابہت کی وجہ سے ایک ہی زمرہ
میں رکھا ہے، لیکن اپنی نیت و ارادہ کے اعتبار سے
یہ دو الگ الگ جماعتیں ہیں، اس وجہ سے ہم
یہاں ان دونوں کی صفات و خصوصیات پر مختصراً
علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔

''ضعفا و منافقین'' میں مشابہت محض ظاہری ہوتی
ہے۔ اپنی نیت اور ارادے کے اعتبار سے یہ بالکل
الگ الگ لوگ ہیں۔ چنانچہ ان کے اوصاف و
خصائص کو بھی اسی طرح الگ الگ سمجھنا چاہیے۔
''ضعفا'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو پیغمبر کی دعوت کو
کسی نہ کسی مرحلے

ضعفاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو حق سمجھ کر قبول تو کر لیتے ہیں اور نتیجاً اسی حق کے مطابق زندگی بھی بسر کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کی قوتِ ارادی کمزور ہوتی ہے، اس وجہ سے خلوصِ نیت کے باوجود راہِ حق میں لڑکھڑاتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ لوگ بار بار گرتے اور اٹھتے ہیں، لیکن ہر گرنے کے بعد ان کا اٹھنا راہِ حق پر چلنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ گریں تو پھر اٹھنے کا نام ہی نہ لیں، یا اٹھیں تو اٹھ کر حق کے بجائے باطل ہی کی راہ پر دوڑ پڑیں، یہ لوگ اپنی تقصیر کے معترف اور اس پر نادم و شرمسار ہوتے ہیں اور برابر توبہ و استغفار سے اس کا ازالہ کرتے رہتے ہیں۔ ذہن اور نیت کے اعتبار سے یہ فروتر نہیں

میں، بلکہ بعض اوقات اس کی ابتدا ہی میں قبول کر لیتے ہیں اور ان کی نیت بھی یہی ہوتی ہے کہ اپنی زندگی میں اس کے تقاضے پورے کریں، لیکن قوتِ ارادی میں کمزوری کی وجہ سے بار بار گرتے اور اٹھتے ہیں۔ تاہم ان کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ہر بار جب گرتے ہیں تو توبہ و استغفار کے ذریعے سے اپنی خطاؤں کا ازالہ کرتے اور اپنا سفر ہر حال میں راہِ حق ہی پر جاری رکھتے ہیں۔

''منافقین'' اس کے برخلاف وہ لوگ ہیں جو کبھی محض عارضی تاثر کی بنا پر اور کبھی بہت سوچ سمجھ کر شرارت کے ارادے سے پیغمبر کے ساتھ آ جاتے ہیں۔ پہلی صورت میں یہ ہمیشہ ''مذبذبین بین ذلک

ہوتے، اس وجہ سے ان میں بہتیرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دعوت کے بالکل ابتدائی دور میں اس کو قبول کرنے کی ہمت کر لیتے ہیں لیکن آزمائش کے موقعوں پر ان کی قوتِ ارادی کا ضعف نمایاں ہوتا رہتا ہے اور شروع سے آخر تک یہ برابر تربیت واصلاح کے محتاج رہتے ہیں۔

☆ منافقین کا گروہ زبانی اقرار کی حد تک تو دعوتِ حق کا ساتھی ہوتا ہے، لیکن ان کا دل باطل کے ساتھ ہوتا ہے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ محض کسی عارضی تاثر سے یہ حق کے ساتھ ہو جاتے ہیں، پھر جب راہ حق کی صعوبتیں اور آزمائشیں آتی ہیں تو اپنی اس غلطی پر پچھتاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جہاں سے آئے ہیں وہیں واپس چلے جائیں لیکن محض جھوٹی شرم کی وجہ سے حق کے ساتھ مجبورانہ بندھے رہتے ہیں۔

لاالیٰ ھؤلاء ولا الی ھؤلاء'' کی تصویر بنے رہتے ہیں اور دوسری صورت میں ان کی حیثیت اہل ایمان کی صفوں میں دشمنوں کے ایجنٹ کی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کا کردار بھی وہی ہوتا ہے جس کی توقع اس طرح کے کسی ایجنٹ سے کی جا سکتی ہے۔

پیغمبر کے مخاطبین میں موافقین اور مخالفین کے یہ دونوں فریق جب پوری طرح ممیّز ہو جاتے ہیں اور پیغمبر بھی اپنے ساتھیوں کی معیت میں جنگ کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو خدا کی عدالت اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں یہ فیصلہ جس طرح صادر ہوا، اس کی تفصیلات یہ ہیں:

ا۔ قریش کی قیادت میں سے تمام معاندین بدر کے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ حق کی طرف آتے ہی شرارت کے ارادہ سے ہیں تا کہ اہلِ حق کے کیمپ کے اندر گھس کر فساد کے مواقع تلاش کریں۔ محض دکھاوے کے لیے حق کے ہمدرد و ہوا خواہ بن جاتے ہیں، حقیقت میں دشمنوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ حق کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر اس سے مرعوب ہوجاتے ہیں اور اپنے دنیاوی فوائد کی خاطر کچھ ظاہری لگاؤ اس کے ساتھ بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے بعض دوسرے محرکات و اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ حق کا اظہار تو کر دیتے ہیں اور ممکن حد تک اس بات کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ اس اظہار کو نباہتے ہیں، لیکن قدم قدم پر ان کی غلطیاں اور شرارتیں حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرتی رہتی ہیں۔ [دعوت دین اور اس کا طریقہ کار ص ۱۹۱ تا ص ۲۰۴ اشاعت ۲۰۰۵ء فاران فاؤنڈیشن لاہور]

موقع پر ہلاک کر دیے گئے۔ یہ صرف ابولہب تھا، جس نے اس عذاب سے بچنے کی کوشش کی اور جنگ میں شامل نہیں ہوا۔ قرآن اس کے بارے میں اعلان کر چکا تھا کہ اپنے اعوان و انصار کے ساتھ اسے بھی بہرحال ہلاک ہونا ہے۔ چنانچہ بدر میں قریش کی شکست کے ساتھ دن بعد یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوگئی اور بنی ہاشم کے اس سردار کا عدسہ کی بیماری سے اس طرح خاتمہ ہوا کہ مرنے کے بعد بھی تین دن تک کوئی اس کے پاس نہ آیا۔ یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور بدبو پھیلنے لگی۔ آخر کار ایک گڑھا کھدوایا گیا اور لکڑیوں سے دھکیل کر اس کی لاش اس میں پھینک دی گئی۔

۲۔ احد اور احزاب میں مسلمانوں کی تطہیر وتزکیہ کے بعد مشرکینِ عرب کے تمام متربصین اور مغفلین کو الٹی میٹم دے دیا گیا کہ ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد رسوائی کا عذاب ان پر مسلط ہو جائے گا جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اس دنیا میں نہ پاسکیں گے۔

مضمون جاری ہے آئندہ شمارہ میں خالد مسعود اور امین احسن اصلاحی کے سرقوں کی تفصیلات ملاحظہ کیجیے اور غامدی اصلاحی مکتب فکر کی جانب سے ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، سلیمان ندوی، عبداللہ العمادی پر سرقہ نویسی کے الزامات کا جائزہ۔ ساحل]